ماہنامہ

ترجمان القرآن

جاری کردہ

مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ

ادارہ ترجمان القرآن (پرائیویٹ) لمیٹڈ، اچھرہ، لاہور (پاکستان)

ترجمۂ قرآنِ مجید

مع مختصر حواشی

سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ

اِس میں

مُترجم نے قرآنِ حکیم کے متن اور تفہیم القرآن کے ترجمے کے ساتھ بہت مختصر حواشی درج کر دیے ہیں تاکہ عام لوگ جو قرآنِ مجید کا سیدھا سادہ مفہوم سمجھنا چاہتے ہیں وہ ایک ہی جلد میں تفہیمُ القرآن کے خلاصے سے فائدہ اُٹھا سکیں۔

سائز: ۲۳×۳۶/۱۶ ○ صفحات: ۱۵۸۴ ○ کاغذ: امپورٹڈ مکینیکل ○ ہدیہ: -/۱۵۰ روپے

اِدارہ ترجمان القرآن (پرائیویٹ) لمیٹڈ

اردو بازار • لاہور ○ فون نمبر: ۲۳۴۰۱۴ - ۲۳۶۶۶۵

پوسٹ بکس نمبر: ۱۴۴۳

جلد ۱۱۷ اپریل ۱۹۹۲ء عدد ۲

ماہنامہ

ترجمان القرآن

جاری کردہ:

مولانا سید ابو الاعلیٰ مودودیؒ

ادارہ ترجمان القرآن (پرائیویٹ) لمیٹڈ، اچھرہ، لاہور (پاکستان)

ماہنامہ ترجمان القرآن لاہور

رجسٹرڈ نمبر ایل ۵۲۴۰

جلد ۱۱۷ | اپریل ۱۹۹۲ء شوال ۱۴۱۲ھ | عدد ۴

فہرست مضامین

رابطہ و ترسیل زر کے لیے: ادارہ ترجمان القرآن (پرائیویٹ) لمیٹڈ۔ رحمن مارکیٹ۔ اردو بازار، لاہور

فون نمبر: ۲۳۴۰۱۴ - ۲۳۶۶۶۵ | پوسٹ بکس نمبر: ۱۳۴۳

فی پرچہ: ۶ روپے | زر سالانہ: ۶۰ روپے

سید حسین فاروق مودودی نے مکتبہ جدید پریس لاہور سے چھپوا کر دفتر ترجمان القرآن [illegible] سے شائع کیا

اشارات

رمضان کا مہینہ، نزولِ قرآن کا مہینہ، مسلسل صیام و قیام کا مہینہ، تیز ہوا سے زیادہ جود و سخاوت کا مہینہ، ختم ہونے والا ہے، اور یہ مہینہ ختم ہوتے ہی عید کا دن سایہ فگن ہوگا۔ یہ دن جشن منانے کا اور خوشیوں کے شادیانے بجانے کا دن ہے۔ یہ زینت و تجمل، اچھے لباس اور مہکتی خوشبوؤں، کھانے پینے اور وصل کے لطف اٹھانے کا دن ہے، جیسا فرمایا گیا کہ ایام اکلٍ وشربٍ و بعالٍ (او کمال قال صلی اللہ علیہ وسلم)۔ ساتھ ہی، بلکہ یہ سب خوشیاں منانا بھی اسی لیے ہے کہ 'یہ دن ہدایت الٰہی کی نعمت کی خوشی میں اللہ کی کبریائی اور حمد کا غلغلہ بلند کرنے اور شکر کی نذر پیش کرنے کا دن ہے۔ وَلِتُكَبِّرُوا اللّٰهَ عَلٰى مَا هَدٰىكُمْ وَلَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ (اور جس ہدایت سے اللہ نے تمہیں سرفراز کیا ہے، اس پر اللہ کی کبریائی کا اظہار و اعتراف کرو اور شکر گزار بنو۔)

قوموں کی ذلت و عزت اور عروج و زوال کا انحصار ان کی سوچ اور کردار پر ہوتا ہے۔ اور قوموں کی سوچ اور نفسیات کی تشکیل اور کردار و حیاتِ ملی کی تعمیر و بقا میں، خوشیاں منانے کے یہ قومی دن، یا تہوار، بڑا اہم حصہ ادا کرتے ہیں۔ بلکہ مطلوبہ اجتماعیت کی تشکیل کے لیے یہ ناگزیر ہیں۔ اسی لیے دنیا کی کوئی قوم و ملت اور مذہب و مسلک ایسا نہیں جس کی اجتماعی زندگی جشن منانے کے ایسے دنوں سے خالی ہو۔ اسی حقیقت کو، بخاری و مسلم میں حضرت عائشہؓ کی روایت کے مطابق، نبی اکرمؐ نے عید الاضحیٰ کے بعد ایام منیٰ میں یوں بیان فرمایا کہ یا ابابکر ان لکل قوم عیدًا وھذا عیدنا، اے ابوبکرؓ ہر قوم کی عید ہوتی ہے، اور یہ ہماری عید ہے۔ حضرت انسؓ بیان کرتے ہیں کہ جب نبیؐ مدینہ تشریف لائے تو اہل مدینہ نے دو دن مقرر کر رکھے تھے جو وہ کھیل و تفریح میں گزارتے تھے۔ حضورؐ کے پوچھنے پر جب انہوں نے یہ بتایا کہ یہ دن ایام جاہلیت سے ہی چلے آرہے ہیں، تو آپؐ نے فرمایا کہ اللہ نے تمہیں ان دو دنوں کی جگہ ان سے

کہیں بہتر دو دن عطا فرمائے ہیں' یعنی یوم الاضحیٰ اور یوم الفطر (ابو داؤد)۔

اس لحاظ سے ملتِ اسلامیہ کی دونوں عیدیں' ایک قوم ہونے کی حیثیت سے' ہماری ملی ضروریات پوری کرنے میں دیگر اقوام کے تہواروں سے بہت مماثل بھی ہیں' اور ہمارے مسلم ہونے کی حیثیت میں' کئی پہلوؤں سے یکسر مختلف بھی۔ ہماری حیاتِ ملی کی تشکیلِ نو اور معاشرہ میں دعوت و اصلاح کے عظیم الشان کام کے لیے عید کی حقیقت اور بعض حکمتوں کو سمجھنا اور ان کو ملحوظ رکھنا بہت ضروری ہے۔

جشن منانے کے یہ دن تاریخ اور فطرت کے ان واقعات اور فیضانات کے دن ہوتے ہیں جنھوں نے ایک قوم کو اس کا وجود بخشا ہوتا ہے' جو اس کا مقصدِ قومی متعین کرتے ہیں' اسے اس کا تشخص عطا کرتے ہیں' اس کی حیاتِ اجتماعی کی تشکیل کرتے ہیں' اور جن کو قوم اپنے حق میں سب سے عظیم انعامات تصور کرتی ہے۔ جس طرح ہر فرد کی روح ہوتی ہے جس پر اس کی جسمانی زندگی کا انحصار ہوتا ہے' اسی طرح جسدِ قوم کی بھی روح ہوتی ہے۔ جس طرح ہر فرد کا حافظہ ہوتا ہے جس پر اس کے وجود معنوی کی زندگی اور سعی و عمل کا انحصار ہوتا ہے' اسی طرح ہر قوم کا بھی ایک حافظہ ہوتا ہے۔ مدعا و مقصد جسدِ قومی کے لیے روح کی حیثیت رکھتا ہے' اور تاریخ و فطرت کے واقعات سے اس کا حافظہ تشکیل پاتا ہے۔ حافظہ جتنا قوی ہوگا' اس میں تاریخی اور مادی انعامات کا شعور و احساس جتنا راسخ ہوگا' اتنا ہی جسدِ قومی میں مقصد کی روح کا وجود مضبوط اور راسخ ہوگا۔ قومی تہواروں کی اصل اہمیت اسی لیے ہے کہ وہ قوم کے حافظہ کو بیدار رکھتے ہیں' اس کو قوی بناتے ہیں' اس میں اہم انعامات کی یاد راسخ کرتے ہیں' اور ان انعامات کی علامات کو ان سارے شعائرِ قومی میں سب سے اعلیٰ اور ممتاز مقام عطا کرتے ہیں' جن کے محور پر قوم کا وجود' اس کی حیات' اس کا تشخص اور اس کی نفسیات' سب استوار ہوتی ہیں۔

مثلاً یہودی فرعون کی غلامی سے نجات کا' عیسائی حضرت عیسیٰؑ کی پیدائش کا' اور ہندو راون کے خلاف رام کی فتح کا جشن مناتے ہیں۔ یا بہت سی قومیں موسمِ بہار کی آمد کا' فصل کی کٹائی کا' بہار اور خزاں میں دن رات برابر ہو جانے کا' موسم سرما میں رات چھوٹی اور دن بڑا ہونے کا' یا سال کے نئے دن کا جشن مناتی ہیں۔

ملت اسلامیہ کے جشن کے مواقع ان سب مواقع سے بالکل مختلف اور منفرد ہیں' کیوں کہ اس کو وجود اور تشخص بخشنے والی چیز ان سب سے مختلف ہے۔ ہمیں وجود' تشخص اور زندگی

بخشنے والی چیز قرآن ہے‘ اس لیے ہمارا جشنِ عید نزولِ قرآن کی سالگرہ کا جشن ہے۔

ہمارا جشنِ عید کسی شخصیت کے ساتھ وابستہ نہیں‘ حالانکہ اگر کوئی شخصیت اس کی مستحق ہے کہ ساری انسانیت اس کی پیدائش کا جشن منائے تو وہ رحمت للعالمینؐ کی شخصیت ہے۔ ہم تو اس کتابِ ہدایت کے نزول کا جشن مناتے ہیں جو اس شخصیت کے قلبِ مبارک نے ماہِ رمضان میں ہمارے ربِّ کریم سے لے کر ہم تک پہنچانا شروع کی۔ یہ قدرت کا مزید عطیہ ہے کہ یومِ بدر اور یومِ فتح مکہ بھی اسی ماہ میں جمع ہو گئے جس ماہ میں نزولِ قرآن کی لیلہ مبارکہ واقع ہے‘ اور نزولِ قرآن کے جشن نے ان دونوں اہم واقعات پر خوشیوں کو بھی اپنے اندر سمیٹ لیا۔ ہم موسمِ بہار کی آمد آمد کا جشن نہیں مناتے‘ بلکہ حیاتِ انسانی میں صلاح و خیر کی اس بہار کی آمد کا جشن مناتے ہیں جو قرآن لے کر آیا۔ ہم سال کی پہلی فصل کٹنے پر شکر کی نذر نہیں پیش کرتے بلکہ‘ تاریخ انسانی میں بڑھنکی کی وہ سب سے لہلہاتی فصل بوئے جانے کا جشن مناتے ہیں جس سے انسان نے صدیوں اپنی جھولی بھری۔ ہم موسمِ سرما کی طویل اور تاریک رات گزر جانے کی خوشیاں نہیں مناتے‘ بلکہ انسانیت کی شبِ ظلم و فساد گزر جانے اور عدل و سلامتی کی وہ صبح طلوع ہونے کی خوشیاں مناتے ہیں جس کی نوید قرآن نے سنائی۔

عید کی خوشیاں‘ رمضان کی برکتوں سے فیضیاب ہونے کی‘ صیام و قیام کی توفیق پانے کی‘ مجاہدۂ رمضان مکمل ہو جانے کی خوشیاں ضرور ہیں‘ مگر عید کے جشن کا فی الحقیقت نزولِ قرآن کا جشن ہونا بالکل صاف اور واضح ہے۔ اس عید کا‘ نزولِ قرآن کے مہینے اور امانتِ قرآن کا حق ادا کرنے کے لیے مجاہدہ کے اختتام پر واقع ہونا ہی اس امر کا بین ثبوت ہے۔ رمضان اور روزہ کے سلسلہ بیان ہی میں قرآن نے مدتِ صیام کی تکمیل کے بعد ہدایت کی نعمت پر تکبیر اور شکر کا حکم دیا ہے۔ (البقرہ:۱۸۵) نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے دونوں عیدوں کے دنوں میں **اللّٰہ اکبر اور وللّٰہِ الحمد** کی تسبیح کا اہتمام کر کے‘ ان عیدوں کا قرآن کے ساتھ وابستہ ہونا واضح کر دیا ہے۔ عید کی خوشیاں اس ارشادِ الٰہی کی تعمیل بھی ہیں کہ ”یہ اللہ کا فضل اور اس کی مہربانی ہے کہ یہ چیز (قرآن) اس نے بھیجی‘ پس یہ ہے جس پر تم لوگوں کو خوشی منانی چاہیے‘ یہ ان سب چیزوں سے بہتر ہے جنھیں لوگ سمیٹ رہے ہیں“ (یونس: ۵۸)۔

نہ صرف عید الفطر‘ بلکہ عید الاضحیٰ کا جشن بھی قرآن ہی سے وابستہ ہو گیا ہے۔ یہ سنتِ ابراہیمی کی یادگار ضرور ہے‘ لیکن یہ تکمیلِ دین‘ اتمامِ نعمتِ ہدایت اور عطائے دینِ اسلام کا جشن بھی ہے۔ امام بخاریؒ روایت کرتے ہیں کہ یہود حضرت عمرؓ کے پاس آئے اور **الیوم اکملت**

لکُمْ دِیْنَکُمْ ... الخ کے بارے میں کہا کہ تم ایک ایسی آیت پڑھتے ہو جو اگر ہمارے پاس ہوتی تو ہم اس کے نزول کو عید بنا لیتے۔ حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ "مجھے خوب یاد ہے کہ یہ آیت کب اور کہاں اتری' اور جب وہ اتری تو رسول اللہؐ کہاں تھے۔ یہ عرفہ کا دن تھا' اور واللہ ہم اس وقت میدان عرفات میں تھے۔" یہ عرفہ کے بعد ہی کا دن ہے جب سارے عالم میں امت جشنِ عید مناتی ہے۔

عید کا جشن یہ پیغام دیتا ہے کہ قرآن کو صرف مراسمِ عبادت ہی کا مرکز بنانا کافی نہیں' اسے ثقافت' تہذیب' معاشرت اور حیات اجتماعی کا مرکز بنانا بھی حیاتِ ملی کے لیے ضروری ہے۔ جب ملت کے اجتماعی شعور میں قرآن کا مقام اجاگر اور راسخ ہوگا' جب اس نعمت کا احساس قلب و ذہن پر چھائے گا' جب اجتماعی ذہن میں اس کے سب سے بڑی نعمت ہونے پر شکر اور اس نعمت کا حق ادا کرنے کی فکر غالب ہو جائے گی' تب ہی ملت کے جسد میں نئی روح دوڑے گی' اور اس کے احیا و استحکام کا اور اس کی وحدت کا مقصد حاصل ہوگا۔

عید کی قومی خوشیوں کو قرآن پر مرکوز کر دینا اس حقیقت کا واشگاف اظہار بھی ہے کہ انسانوں کو جمع اور تقسیم کرنے' یعنی وحدت انسانی' کے لیے صحیح بنیادیں شخصیت' موسم' فصل' نسل' رنگ' زبان اور زمین جیسی حسی اور مادی نہیں' بلکہ معنوی اور روحانی ہیں' عقیدہ اور ایمان ہیں' جو قلب و ذہن میں بستی ہیں۔ وحدتِ انسان اور آفاقیت کا یہ ایک ایسا بے مثال درس ہے جس کی نظیر کسی ملت و مسلک میں نہیں پائی جاتی۔

جس قرآن عظیم کے بارہ میں کہا گیا ہے کہ "ہم نے اسے پہاڑ پر بھی اتار دیا ہوتا تو تم دیکھتے کہ وہ اللہ کے خوف سے دبا جا رہا ہے اور پھٹا پڑتا ہے" اس کے نزول اور اس کے اہتمام کی یاد کو قومی نفسیات اور ثقافت و تہذیب میں راسخ کرنے کے لیے ان دنوں کو جشن کا دن قرار دینے میں بڑی گہری حکمت پوشیدہ ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے دین کو "ھُدًی لِلنَّاس" قرار دیا ہے۔ یہ بھی واضح کر دیا ہے کہ دین کے احکام میں اسے اپنے بندوں کے لیے یسر مطلوب ہے نہ کہ عسر۔ نبی کریمؐ نے بھی اعلان فرمایا کہ دین یسر ہے' اور اپنے اصحابؓ کو ہدایت کی کہ "آسانی پیدا کرو' مشکل اور تنگی میں نہ ڈالو' خوشخبری دے کر خوش کرو' متنفر نہ کرو" اور فرمایا کہ "تم آسانی پیدا کرنے والے بنا کر مبعوث کیے گئے ہو' نہ کہ تنگی میں ڈالنے والے۔" نیز یہ بھی کہ "ابراہیمؑ کا دین سب سے سہل اور سادا دین ہے۔"

تیسیرِ دین کا ایک اہم اصول' منجملہ دیگر اصولوں کے یہ بھی ہے کہ عامۃ الناس کے قلوب

اور عملی زندگیوں میں دین کے اصول و مقاصد راسخ کرنے کے لیے' اور انھیں دین کے احکام پر قائم کرنے کے لیے' فطرتِ انسانی کے تقاضوں کو ملحوظ رکھا جائے۔ خوشی اور غم کے موقعوں پر رسوم کا منانا' اور اکل و شرب' زینت و تجمل' اور لعب و تفریح کی طرف میلان اور رغبت رکھنا بھی انسانی فطرت میں داخل ہے۔ چنانچہ یہ تیسیر دین کا تقاضہ ہوا کہ اپنے مقصد سے لگن' اور ہدایتِ الٰہی کو نعمتِ عظمیٰ سمجھنے کے احساس کو ذہن اجتماعی پر مرتسم کرنے کے لیے خوشی اور جشن منانے کا طریقہ بھی اختیار کیا جائے' اور اعلائے کلمتہ اللہ' تکبیر اور شکر کو ان فطری میلانات کی تکمیل کے ساتھ مربوط کر دیا جائے۔ لوگ گھروں سے نکلیں اور بڑے بڑے اجتماعات منعقد کریں تو بغیر جبر کے اپنی خوشی اور رغبت کے ساتھ کریں۔ دینی اعمال اور عوام کی معاشرتی و تہذیبی زندگی ایک دوسرے کے ساتھ مربوط ہو جائیں' بلکہ ایک ہی بن جائیں۔

اسی لیے عید کے دن کو کھانے پینے کا دن قرار دیا گیا' زینت والے لباس پہننے اور خوشبوئیں لگانے کی ترغیب دی گئی' کھیل اور تفریح کو ناپسندیدہ لہو و لعب قرار دے کر ان سے منع نہیں کیا گیا۔ بخاری اور مسلم کے مطابق' حضرت عائشہؓ بیان کرتی ہیں کہ عید الاضحیٰ کے دنوں میں قیام منیٰ کے دوران' حضرت ابوبکرؓ ان کے پاس تشریف لائے۔(گویا یہ حج الوداع کا واقعہ ہے)۔ اس وقت انصار کی دو لڑکیاں ان کے پاس بیٹھی ہوئی دف بجا رہی تھیں۔ ایک روایت میں ہے کہ انصار نے ایامِ جاہلیت کی جنگِ بعاث کے سلسلہ میں جو اشعار کہے تھے وہ گا رہی تھیں۔ پاس ہی نبی صلی اللہ علیہ وسلم چادر اوڑھے لیٹے ہوئے تھے۔ حضرت ابوبکرؓ نے ان دونوں لڑکیوں کو ڈانٹا۔ نبیؐ کریمؐ نے (جو جاگ رہے تھے) اپنے چہرہ سے کپڑا ہٹایا اور فرمایا کہ "اے ابوبکر! ان کو چھوڑ دو' یہ عید کا دن ہے۔" حضرت ابوبکرؓ نے کس چیز کو ناپسند فرمایا؟ لڑکیوں کا دف بجانا' گانا' یا ایام جاہلیت کی عصبیت وتفاخر کی جنگ کے اشعار کا گانا' یا رسول اللہؐ کی موجودگی میں یہ سب کچھ ہونا' یا ان کا آپؐ کے آرام میں مخل ہونا' یہ بات تو حدیث سے پوری طرح واضح نہیں ہوتی' لیکن حضورؐ کی اجازت' عید کی مناسبت سے' واضح ہے۔

جمعہ کو بھی عید کا دن قرار دیا گیا ہے (یہودیوں کے ہاں بھی یومِ سبت' یومِ عید شمار ہوتا ہے)۔ جمعہ کے بارے میں ارشادات نبویؐ بھی دین کی اسی حکمت کو واضح کرتے ہیں۔ عیدین کے ایام میں تو روزہ منع ہے' جمعہ کے دن کو بھی روزہ کے لیے مخصوص کرنے کو ناپسند کیا گیا ہے۔ تا کہ شارع نے اس دن جن چیزوں کا اہتمام کیا ہے' ان میں ایک زائد چیز کا اضافہ نہ ہو جائے۔ اس لیے بھی کہ جمعہ کے دن مسلمانوں کے بڑے بڑے اجتماعات مطلوب ہیں' یہ اور رغبت و دل

پسندی کے ساتھ منعقد ہوں۔ روزہ کے زہد خشک جمعہ کے عید ہونے کی حیثیت مجروح ہو سکتی ہے۔ اب یہ بھی دیکھیے کہ عید جمعہ کی بشارتیں کن اعمال پر منحصر کی گئی ہیں۔ غسل کرنا' بحدِ استطاعت پاکیزگی کرنا' اپنے کپڑوں میں سے اچھے کپڑے پہننا' یا جمعہ کے لیے ایک زائد جوڑا بھی بنا لینا' خوشبو لگانا' گھر سے نکلنا' امام کے خطبے سے پہلے مسجد پہنچ جانا' لوگوں کی گردنوں کو پھاندتے ہوئے مسجد میں نہ داخل ہونا' کسی مسلمان بھائی کو اس کی جگہ سے نہ ہٹانا' اس کی جگہ خود نہ بیٹھنا' خطبہ خاموشی سے سننا' یہاں تک کہ کسی سے یہ بھی کہے کہ خاموش رہو تو اس کا جمعہ نہیں ---- اور پھر دو رکعت نماز پڑھ لینا۔ ان میں کسی کا کرنا واجب قرار دیا گیا ہے' کسی کے نہ کرنے پر سخت وعید سنائی گئی ہے' اور تعمیلِ ارشادات پر ایک جمعہ سے دوسرے جمعہ تک کے گناہوں کی مغفرت کی بشارت دی گئی ہے۔ (بخاری' مسلم' احمد' ترمذی' ابن ماجہ بحوالہ مشکوٰۃ)

علامہ ابن قیم نے' اعلام الموقعین میں' حضورؐ کی تقریری سنت کے ضمن میں (یعنی جو کام آپؐ کے سامنے ہوئے اور آپؐ نے ان سے منع نہ فرمایا) اس قسم کی کئی چیزیں بیان کی ہیں۔ مثلاً مباح اشعار کا پڑھنا اگرچہ ان میں زمانہ جاہلیت کا ذکر ہو' ایسے اشعار کا پڑھنا بھی جن میں غزل گوئی ہو اور ایسی باتیں ہوں کہ شعر کے باہر ان کا اقرار کیا جائے تو سزا ہو (جیسے کعب بن زہیر کی سعاد کی غزل گوئی اور حضرت حسان کا رنگِ تغزل)' موقعۂ جہاد پر فخریہ اشعار کا پڑھنا' جہاد میں ریشمی لباس پہننا' بہادروں کو امتیازی نشانات لگانا' پیٹ بھر کر کھانا' مسجد میں سونا' وغیرہ وغیرہ۔ اس سلسلے میں وہ دو اہم تشریعی اصول بھی بیان کرتے ہیں۔ اوّل یہ کہ فعل کی اصل اباحت ہے' حرمت اسی وقت ہوگی جب حرمت ثابت ہو۔ دوسرے' غزل گوئی کے سلسلے میں کہتے ہیں کہ اس میں جو فساد کا خطرہ ہے' تو فساد سے کہیں زیادہ وہ فائدہ ہے جو اصل مقصود ہے۔ غزل گوئی کہ یہ طرز لوگوں کے دلوں کو جھکانے والی اور انھیں اپنی جانب متوجہ کرنے والی ہے' اور اس قسم کے مضامین سے بعد کا مضمون مطلوب ذہن نشین اور دل میں جاگزیں ہو جاتا ہے۔

نہ صرف عیدین اور جمعے میں' بلکہ عام معاشرت میں' گھروں میں' بازاروں میں' پبلک مقامات اور تفریحات میں عبادت گاہوں میں' بلکہ تمام ثقافتی اور تہذیبی زندگی میں دین کی اس حکمت تیسیر کو ملحوظ رکھنے ہی سے دین زندگی کے کونوں اور گوشوں سے سرک کر مرکز میں آسکے گا' اور روزمرہ کی زندگی میں ایک متحرک روح کی طرح رواں دواں بن سکے گا۔ پبلک مقامات کو صاف ستھرا اور معطر ہونا چاہیے۔ کھانوں' کپڑوں' اور جائز لعب و تفریح کی گنجائش' احکام الٰہی کی حدود میں' دین کے دائرہ کے اندر ہی نکلنا چاہیے' نہ کہ اس سے باہر۔

اگر امت مسلمہ کا جشنِ قرآن صرف کھانے پینے' اچھے کپڑے پہننے' خوشبوؤں میں بسنے' اور کھیل و تفریح تک محدود رہ جاتا تو یہ بھی جاہلیت کی تاریکی میں گم ہو جاتا۔ اس لیے اس جشن میں صلوٰۃ' ذکر' تکبیر' حمد اور شکر کا اہتمام بھی لازم ہوا۔

نبی کریمؐ نے ارشاد فرمایا کہ **"زینوا اعیاد کم بالتکبیر"** یعنی اپنی عیدوں کو تکبیر سے سجاؤ (طبرانی) **اللہ اکبر اللہ اکبر لا الٰہ الا اللہ و اللہ اکبر و للہ الحمد** کی تسبیح اس قرآنی ہدایت کی تعمیل بھی ہے کہ تمہیں جو ہدایت (قرآن کے ذریعے) بخشی گئی ہے اس پر اللہ کی کبریائی بیان کرو' اور اس کے شکر گزار بنو۔ عیدالفطر پر یہ تکبیر پست آواز میں کہنا چاہیے' عید الاضحیٰ پر بلند آواز سے۔ اللہ تعالیٰ کی کبریائی کا اعلان و اقرار اور اس کی حمد' شعائر میں سے عظیم شعائر ہیں۔ نماز کے ارکان تکبیر کے تابع ہیں' جماعت کی نقل و حرکت تکبیر کی تابع ہے' نمازوں کے اختتام پر بھی صدائے تکبیر بلند ہوتی تھی۔ اذان و اقامت کی ابتدا تکبیر سے ہوتی ہے' جہاد میں عزم کی پختگی' حوصلے کی بلندی' اور سرفروشی کے جذبے کا راز تکبیر میں مضمر ہے۔ اسی طرح صبح سے رات تک ہر نعمت پر' ہر حالت میں' نیند سے اٹھنا ہو' صبح ہو' شام ہو' بیت الخلا ہو' کھانا پینا ہو' کپڑے پہننا ہو --- ہر ایک حالت میں الحمد کی روح بھر دی گئی ہے' ہر ایک کے ساتھ الحمد کا کلمہ جوڑ دیا گیا ہے۔

ایسا محسوس ہوتا ہے کہ عیدین کے موقعوں پر تکبیر پڑھنے کا رواج کچھ کم اور کچھ متروک سا ہوتا جا رہا ہے۔ شاید اس زمانے میں خدا کا نام لینے سے شرم آتی ہے' یا ڈر لگتا ہے۔ چاند ہوتے ہی گھروں میں' نماز عید کے لیے جاتے ہوئے راستوں میں' مسجدوں اور عیدگاہوں میں' تکبیر کی آواز بہت کم سنائی دیتی ہے۔ حالانکہ تکبیر پست آواز سے کہی جائے تو بھی ہر جگہ ہزاروں لاکھوں شہد کی مکھیوں کی بھنبھناہٹ کی طرح آواز ہو' اور باآواز بلند کہی جائے تو گھر' راستے' اور مقاماتِ نماز گونج اٹھیں۔

ضروری ہے کہ اس شعار کو زور شور سے اختیار کیا جائے' اس کی ترغیب دی جائے' اس کی ترویج کی جائے' گھروں میں اس کا رواج ہو' راستوں پر غلغلہ ہو' نماز گاہیں گونجیں۔ اسی طرح عورت' مرد' بچے' سب کی نفسیات پر تکبیر و حمد کے یہ نقوش ثبت ہونے کا کام وسیع پیمانہ پر ہوگا۔ ان میں جرات اور حوصلہ پیدا ہوگا۔ جب وہ جرات سے اللہ کا نام باآواز بلند لینے لگیں گے' اس کا ذکر کرنے لگیں گے' تو اس کے نام کے بھی ہو جائیں گے' اس کے کام بھی۔

جشن عید کا ایک مقصود یہ بھی ہے کہ ذکر اور تکبیر و شکر کے لیے مسلمانوں کے بڑے بڑے اجتماعات منعقد ہوں۔ ہر محلے میں ایک چھوٹی سی جماعت عید کر لینے سے یہ مقصد پورا نہیں ہوتا۔ ان بڑے اجتماعات کے لیے گھروں سے نکلنے کی ترغیب ایک سے ایک دلنواز انداز میں دی گئی ہے۔ ایک روایت میں آتا ہے کہ عید کی صبح ہوتی ہے تو اللہ تعالیٰ ہر جگہ اپنے فرشتے بھیجتا ہے۔ وہ زمین پر اتر کے، راستوں پر کھڑے ہو جاتے ہیں، اور صدا بلند کرتے ہیں' اے امت محمدؐ! اپنے رب کریم کی طرف نکلو، جو اجرِ جزیل اور عفوِ عظیم سے نوازتا ہے۔ یہ بھی فرمایا' صلی اللہ علیہ وسلم نے' کہ جب وہ نماز پڑھ چکتے ہیں تو منادی پکارتا ہے' سن لو! تمھارے رب نے تمھیں بخش دیا ہے۔ ایک اور روایت میں آتا ہے "ان سے کہا جائے گا کہ گھروں کو واپس جاؤ' میں نے تم کو بخش دیا ہے' تمھاری خطاؤں کو نیکیوں سے بدل دیا ہے۔" پس وہ عیدگاہ سے اس حال میں واپس ہوتے ہیں کہ ان کے گناہ بخشے ہوئے ہوتے ہیں۔ (بیہقی' ابن حبان' طبرانی)

حضورؐ نے عید کے اجتماع میں عورتوں کی حاضری کا بھی خصوصی اہتمام کیا' اور تاکید فرمائی۔ حضرت ام عطیہؓ کہتی ہیں :

> ہمیں حکم دیا گیا کہ ہم سب عورتیں عیدین کے دن گھروں سے نکلیں' حائضہ بھی اور پردہ والی بھی' تاکہ مسلمانوں کی جماعت میں' اور ان کی دعا میں' شریک ہوں۔ (اگرچہ حائضہ عورتیں مصلے سے الگ رہیں)۔ ایک عورت نے یہ حکم سن کر کہا' یا رسول اللہؐ' ہم میں سے بعض کے پاس چادر نہیں۔ آپؐ نے فرمایا' ساتھ والی اسے اپنی چادر اڑھا دے۔ (بخاری' مسلم)

عورتوں کو اجتماع عید کے لیے جمع کرنے کا حضورؐ نے جس قدر اہتمام کیا' اس کی ایک جھلک ام عطیہؓ کی اس روایت میں ملتی ہے جو ابوداؤد نے نقل کی ہے۔ وہ کہتی ہیں :

> آپؐ نے انصار کی عورتوں کو ایک گھر میں جمع ہونے کا حکم دیا۔ اس کے بعد آپؐ نے ہمارے پاس حضرت عمر بن الخطابؓ کو بھیجا۔ وہ آکر دروازہ پر کھڑے ہوئے اور ہمیں سلام کیا۔ ہم نے ان کے سلام کا جواب دیا۔ اس کے بعد انھوں نے کہا کہ میں تم لوگوں کے پاس رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا قاصد بن کر آیا ہوں۔ پھر انھوں نے ہمیں حکم دیا کہ ہم عیدین میں حائضہ عورتوں اور غیر شادی شدہ نوجوان لڑکیوں کو بھی عید گاہ لے جائیں۔ ساتھ ہی' انھوں نے یہ حکم بھی پہنچایا کہ ہم عورتوں پر جمعہ فرض نہیں' اور ہمیں

جنازے کے ساتھ جانے سے بھی منع فرمایا۔

حضورؐ نے اجتماع عید میں عورتوں سے خصوصی خطاب کا اہتمام بھی کیا۔ چنانچہ حضرت عبداللہ ابن عباسؓ کہتے ہیں کہ ' نماز پڑھنے اور خطبہ دینے کے بعد' رسول اللہؐ عورتوں کے پاس آئے۔ انہیں نصیحت کی' یاد دہانی کی' اور صدقہ دینے کی ہدایت کی۔ میں نے دیکھا کہ عورتوں نے اپنے ہاتھ اپنے کانوں اور گلوں تک بڑھائے' اور زیور اتار اتار کر بلالؓ کو دینا شروع کر دیے۔ (بخاری' مسلم)

ایک طرف عید گاہ میں حاضر کرنے کا اہتمام' دوسری طرف اس بات کی تصریح کہ جمعہ میں' جو فرض ہے (جب کہ عید کی نماز واجب یا سنت موکدہ ہے)' اور جنازے میں' (جو ہر مسلمان کا دوسرے مسلمان پر حق ہے)' عورتوں کا جانا ضروری نہیں۔ بلکہ ان کا گھر میں نماز پڑھنا مسجد میں نماز پڑھنے کے مقابلے میں زیادہ افضل اور پسندیدہ قرار دیا' اور خوشبو لگا کر جانے سے بالکل منع فرما دیا۔ توازن کی راہ ان سب ارشادات کو ملحوظ رکھنے ہی سے ظاہر ہوتی ہے۔ ایک طرف ان کو عید کے اجتماع میں مردوں کی جماعت میں شریک کرکے اسلامی شان و شکوہ میں اضافہ کرنے' شوکت اسلامی کا مشاہدہ کرنے' دشمنانِ اسلام کو مرعوب کرنے' پوری ملت کی خوشی اور اطمینان میں شریک ہونے جیسے اہم دینی مقاصد کا حصول مطلوب ہونا محسوس ہوتا ہے۔ ظاہر ہے کہ عورتوں کا عید گاہ میں نماز پڑھنا مقصود نہ تھا' ورنہ آپؐ حائضہ عورتوں کو بھی عید گاہ جانے کا حکم نہ دیتے۔ دوسری طرف عام اجتماعی سرگرمیوں کو ان پر فرض نہ کرنے میں ان کے خصوصی رول کا تحفظ مطلوب ہونا محسوس ہوتا ہے۔

آج یہ علماءِ حق کی ذمہ داری ہے کہ وہ ملت کے دینی مقاصد' ان کے حصول میں عورتوں کی مناسب شرکت کی ضرورت' دینی احکام و حدود اور ان کی حکمت' --- یہ سب سامنے رکھ کر مناسب اصول و ضوابط مرتب کریں۔ ایک طرف اللہ اور اس کے رسولؐ کی عائد کردہ منہیات و محرمات سے مکمل اجتناب ہو' دوسری طرف ایک زندہ اور متحرک اسلامی معاشرہ وجود میں آئے۔

اجتماع عید میں حضور کے خطاب کے موضوعات کیا ہوتے تھے' یہ بھی جاننا ضروری ہے۔ حضرت ابوسعید الخدریؓ بیان کرتے ہیں کہ

آپؐ لوگوں کے سامنے (نیزہ سے ٹیک لگا کر) کھڑے ہو جاتے اور لوگ اپنی صفوں میں بیٹھے رہتے۔ آپؐ انہیں وعظ و نصیحت کرتے' وصیتیں فرماتے' ضروری احکام صادر کرتے'

کہیں کوئی لشکر بھیجنا ہوتا تو لوگوں کے سامنے اس کا ذکر فرماتے اور اس کی روانگی کا حکم جاری فرماتے' اور کوئی خاص حکم نافذ کرنا ہوتا تو وہ کرتے' اور فرمایا کرتے تھے' صدقہ دو' صدقہ دو۔ (بخاری' مسلم)

قابل غور بات یہ ہے کہ عید کا دن صرف ذکرِ الٰہی اور تکبیر و تحمید ہی کا دن نہ تھا' نہ صرف اکل و شرب' زینت و تجمل اور لعب و تفریح کا۔ مسلمانوں کے بڑے بڑے اجتماعات کی غرض یہ ہوتی تھی کہ ان کو وعظ و تذکیر بھی کی جائے' ان کے امور و معاملات پر بھی گفتگو کی جائے' ان کو ہدایات و احکام بھی دیے جائیں' اور شکوہِ دین کے لیے جہاد کے سلسلے میں مناسب اقدامات بھی اٹھائے جائیں۔

عیدِ آزاداں شکوہِ ملک و دیں عیدِ محکوماں ہجومِ مومنیں

آج مومنین بے یقین کے قلب و نظر محکوم ہیں' فکر و عمل محکوم ہیں' تہذیب و ثقافت محکوم ہے' سیاست و معیشت محکوم ہے' تعلیم و تربیت محکوم ہے' حکمراں محکوم ہیں' عوام محکوم ہیں۔ اسی لیے ان کے ہجوم تو بہت جمع ہو جاتے ہیں' شکوہِ دین میں کچھ اضافہ نہیں ہوتا۔

مومنین کو بایقین و باعمل بنانے کے لیے' ان کے دلوں اور ذہنوں میں مقاصد و احکام دین کے نقوش مرتسم کرنے کے لیے' شکوہِ دین کے حصول کے لیے' عید کا یہ سبق سب سے اہم ہے کہ اس مقصد کے لیے جتنی ضروری دلیل ہے' وعظ ہے' تذکیر ہے' اتنے ہی یا اس سے کچھ زیادہ ہی ضروری علامات ہیں' رسوم ہیں۔ شعائر دینی علامات و رسوم کا کام سرانجام دیتے ہیں' اور ان شعائر میں عید ایک شعار عظیم ہے۔ علامات و رسوم ہی سے دین دل میں اترتا ہے' اس کے ساتھ جذبات وابستہ ہو جاتے ہیں' محبت گہری ہوتی ہے' عمل بڑھتا ہے' اور اجتماعیت مضبوط اور قوی ہوتی ہے۔

حکمتِ مودودیؒ

حرمتِ سُود اور مغرب پرست معاشی مفکرین

عام طور پر سُود کے متعلق اسلامی قانون کے احکام کو سمجھنے میں جو غلطی واقع ہو رہی ہے اس کی اصلی وجہ یہ ہے کہ اس زمانہ میں وہ معاشی نظام جس کو اسلام نے قائم کیا تھا درہم برہم ہو چکا ہے' اس کے اصول و نظریات بھی دلوں سے محو ہو گئے ہیں' اور ہمارے گردو پیش کی دنیا پر ایک ایسا نظام پوری طرح حاوی ہو گیا ہے جس کی بنیاد "سرمایہ داری" کے اصولوں پر رکھی گئی ہے۔ یہ سرمایہ دارانہ نظمِ معیشت نہ صرف عملاً ہم پر محیط ہے بلکہ ہمارے دل و دماغ پر بھی اس کے اصول و نظریات چھا گئے ہیں۔ اس لیے جب کسی معاشی مسئلہ پر ہم نظر ڈالتے ہیں تو ہمارا نقطۂ نظر وہی ہوتا ہے جو سرمایہ داری کا نقطۂ نظر ہے۔ ہماری بحث و تحقیق کی ابتدا ہی اس طرح ہوتی ہے کہ ہم پہلے معاشیات کے سرمایہ دارانہ نظریات اور اصولوں کو مان لیتے ہیں اور اس کے بعد کسی معاشی طریقہ کے جواز و عدمِ جواز پر گفتگو کرتے ہیں۔ لیکن اگر تھوڑی سی سمجھ سے کام لیا جائے تو یہ بات مخفی نہیں رہ سکتی کہ تحقیق کا یہ طریقہ اصلاً غلط ہے۔ اسلام کا نظمِ معیشت اپنے نظریہ اور اپنے اصول میں سرمایہ داری کے نظمِ معیشت سے بالکل مختلف ہے۔ دونوں کے مقاصد الگ الگ ہیں' دونوں کی روح جدا جدا ہے' دونوں کے مناہج علیحدہ علیحدہ ہیں۔ اب اگر کسی مسئلہ کے متعلق سرمایہ داری کے اصول و نظریات کو تسلیم کر کے اسلام کے معاشی احکام میں سے کسی حکم پر نظر ڈالی جائے گی تو لا محالہ یا تو وہ بالکل ہی غلط نظر آئے گا یا اس میں ایسی ترمیم کر دی جائے گی جس سے وہ اسلامی قانون کے اصول سے ہٹ کر بالکل سرمایہ داری کے قالب میں ڈھل جائے گا اور اس میں نہ اسلامی روح باقی رہے گی' نہ اسلامی قانون کے اغراض و مقاصد اس سے حاصل ہو سکیں گے' اور نہ وہ اپنے جوہر میں "حقیقتہً" ایک اسلامی حکم ہو گا۔

یہی بنیادی غلطی ہے جس کی وجہ سے سُود کے معاملہ میں ہمارے جدید معاشی مفکرین اسلامی احکام کو سمجھنے اور ان کے اغراض و مصالح کا ادراک کرنے میں ٹھوکروں پر ٹھوکریں کھاتے چلے

جا رہے ہیں۔ وہ سرے۔ سے یہی نہیں جانتے کہ اسلام کا معاشی نظام کن اصولوں پر قائم کیا گیا ہے، اس کے مقاصد کیا ہیں، اس کی روح کیا ہے، سُود کو اس نے کیوں حرام قرار دیا ہے، سُودی لین دین کی مختلف اشکال میں علتِ حرمت کیا شے ہے، اور جن معاملات میں یہ علت پائی جاتی ہے ان کو اسلامی نظمِ معیشت میں کھپا دینے سے کیا قباحت واقع ہوتی ہے۔ ان تمام اساسی امور سے بیگانہ ہو کر جب وہ کلیتہً سرمایہ داری کے نقطۂ نظر سے سُود کے متعلق اسلامی قانون پر نگاہ ڈالتے ہیں تو ان کو درحقیقت سود کی حرمت کے لیے کوئی دلیل ہی ہاتھ نہیں آتی۔ کیونکہ سود تو سرمایہ داری کی جان اور اس کی روحِ رواں ہے۔ اس کے بغیر سرمایہ دار کا کاروبار چل ہی نہیں سکتا، اور کسی ایسے نظامِ معاشی کا سود سے خالی ہونا غیر ممکن ہے جس کی عمارت سرمایہ داری کے اصولوں پر قائم ہو۔ لیکن مشکل یہ ہے کہ علمی اور عملی حیثیت سے یہ حضرات اسلام سے منحرف ہو چکنے کے باوجود اعتقادی حیثیت سے بدستور اس کے پیرو ہیں اور قصداً اس کے دائرے سے نکلنا نہیں چاہتے، اس لیے عقیدہ کی بندش تو ان کو مجبور کرتی ہے کہ سود کی حرمت سے انکار نہ کریں مگر ان کا علم اور عمل ان کو مجبور کرتا ہے کہ سود کے متعلق اسلامی احکام کی بندشوں کو توڑ دیں۔ دل و دماغ کی یہ کش مکش ایک مدت سے جاری ہے اور اب اس میں مصالحت کی آسان صورت یہ نکالی گئی ہے کہ اسلامی احکام کی تعبیر اس طرح کی جائے کہ سُود ایک اسم بے مسمیٰ ہونے کی حیثیت سے تو بدستور حرام کا حرام رہے، مگر نظام سرمایہ داری میں اس کے جتنے مسمیٰ پائے جاتے ہیں وہ قریب قریب سب حلال ہو جائیں۔

یہ ایک دھوکا ہے جس میں یہ حضرات بغیر سمجھے بوجھے مبتلا ہو گئے ہیں۔ بیک وقت دو مخالف سمتوں میں سفر کرنے والی کشتیوں میں سوار ہونا کسی مردِ عاقل کا کام نہیں ہو سکتا۔ اگر بے خبری کی وجہ سے اس نے ایسا کیا بھی ہو تو ہوش مندی کا تقاضا یہ ہے کہ جونہی اس کو اپنی اس غلطی پر تنبّہ ہو، وہ اپنے لیے دونوں کشتیوں میں سے ایک کو پسند کر کے دوسری کشتی سے فوراً پاؤں کھینچ لے۔ سود کے حلال و حرام ہونے کی بحث اور اس کے حدود کی تعیین تو بعد کی چیز ہے۔ سب سے پہلے یہ ضروری ہے کہ آپ اسلامی نظمِ معیشت اور سرمایہ دارانہ نظمِ معیشت کے اصولی اور روحی فرق کو اچھی طرح سمجھ لیں اور قرآن و حدیث کے احکام پر غور کر کے ان اصول و قواعد سے باخبر ہو جائیں جن پر اسلام نے سرمایہ داری اور اشتراکیت کے درمیان ایک متوسط نظمِ معیشت قائم کیا ہے۔ اس تحقیق سے آپ پر خود بخود منکشف ہو جائے گا کہ اسلام جس ڈھنگ پر انسان کے معاشی معاملات کی تنظیم کرتا ہے اس میں صرف یہی نہیں کہ سُود کی قطعاً

کوئی گنجائش نہیں ہے، بلکہ وہ سرے سے اس نظریہ اور اس ذہنیت اور ان معاشی حالات ہی کا استیصال کر دیتا ہے جن کی وجہ سے سودی معاملات کی مختلف صورتیں وجود میں آتی ہیں۔ اس کے بعد آپ کے لیے ناگزیر ہوگا کہ دو راہوں میں سے ایک راہ کا انتخاب کر لیں۔ ایک راہ یہ ہے کہ آپ اسلام کے اصولِ معیشت کو رد کر کے سرمایہ دارانہ نظامِ معیشت کے اصولوں پر ایمان لے آئیں۔ اس صورت میں آپ کو اسلام کے اصول اور احکام میں ترمیم کرنے کی زحمت ہی نہ اٹھانی پڑے گی۔ بلکہ آپ کے لیے سیدھا اور صاف راستہ یہ ہوگا کہ اس کے اتباع سے انکار کر دیں۔ دوسری راہ یہ ہے کہ آپ اسلام کے اصول معاشی کو تو صحیح سمجھیں اور سود کو اس کی تمام صورتوں کے ساتھ علیٰ وجہ البصیرت حرام جانیں، مگر سرمایہ دارانہ نظام معیشت میں گھر جانے کے باعث اپنے آپ کو اس حرام چیز سے محفوظ رکھنے میں قاصر پائیں اس صورت میں آپ سود کھانا اور کھلانا چاہیں تو کھائیے اور کھلائیے۔ کیونکہ ہر گناہ کرنے کا آپ کو اختیار حاصل ہے۔ مگر ایک مسلمان ہونے کی حیثیت سے یہ جرات آپ کبھی نہیں کر سکتے کہ سود کو حلال کر کے کھائیں یا کھلائیں اور اپنے ضمیر پر سے اکلِ حرام کے بار کو ہلکا کرنے کے لیے اس چیز کو پاک کرنے کی کوشش کریں جس کو خدا اور اس کے رسولؐ نے ناپاک قرار دیا ہے۔ ایک شخص حق رکھتا ہے کہ علانیہ اسلام کے قانون کو رد کر کے کسی دوسرے قانون کی پیروی اختیار کر لے۔ اور بدرجہ آخر یہ حق بھی اس کو حاصل ہے کہ اسلامی قانون کے اقتدار کو تسلیم کرتے ہوئے اس کے ماتحت ایک گناہ گار بندہ بن کر رہنا پسند کرے یا نامساعد حالات میں مجبوراً" ایسا بن جائے۔ لیکن کسی حال میں یہ حق تو کسی کو بھی نہیں پہنچتا، کہ اسلامی قانون کو جس غیر اسلامی قانون سے چاہے بدل دے اور پھر دعویٰ کرے کہ یہ بدلا ہوا قانون ہی دراصل اسلام کا قانون ہے۔

سود لینے یا نہ لینے کی بحث تو ایک بعد کی بحث ہے، سب سے پہلے تو آپ کو یہ طے کرنا چاہیے کہ اسلام کے معاشی نظام کی پیروی کرنی ہے یا سرمایہ داری نظام کی؟ اگر آپ پہلی صورت کو اختیار کرتے ہیں تو اس میں سودی لین دین کی نہ ضرورت ہے نہ گنجائش۔ کیونکہ اسلامی معیشت کا سارا کاروبار ان ادارات کے بغیر چلتا ہے جو سودی لین دین کرنے والے ہیں، اور یہ نظام ان لوگوں کو مجرم سمجھتا ہے جو سودی کاروبار کر کے اس کے نظام کو بگاڑنے کی کوشش کرتے ہیں۔ برعکس اس کے اگر آپ دوسری صورت اختیار کرنا چاہتے ہیں تو آپ کا سرمایہ دارانہ نظام معیشت کو اختیار کرنا بحیثیت مجموعی اسلام کے خلاف ایک بغاوت ہے اور اس بغاوت کی حالت بس آپ کو اسلام کے معاشی قوانین میں سے وہ تمام قوانین توڑنے پڑیں گے جو اصول سرمایہ

بقیہ صفحہ ۲۱

رمضان کے بعد

نعیم صدیقی

ماہِ صیام کی رحمتوں اور برکتوں کی گھٹا موتی برسا کر گزر گئی!

جب بھی کوئی گھٹا برستی ہے تو اس کے کچھ اثرات و نتائج بعد میں بھی باقی رہتے ہیں۔ اور ایک حدیث شریف کی رو سے یہ بات زمین پر بھی منحصر ہے کہ وہ گھٹا کے فیضان کو کہاں تک سنبھال سکتی ہے۔ ایک زمین ایسی ہوتی ہے کہ وہ برکھا کو جذب کرتی ہے اور پھر اس کے اندر روئیدگی پیدا ہوتی ہے' گل و گیاہ نمودار ہوتے ہیں' غلے اور پھل ظہور کرتے ہیں۔ اس روئیدگی سے خلقِ خدا فیضان حاصل کرتی ہے۔ ایک زمین ایسی ہوتی ہے جو خود تو پانی کو جذب کر کے اس سے پھل پھول پیدا نہیں کر سکتی مگر پانی کو اپنے اندر جمع کر لیتی ہے۔ اور پھر اس جمع شدہ پانی سے خشک موسم میں کھیتیاں سیراب ہوتی ہیں۔ پانی کبھی تالابوں اور جھیلوں کی شکل میں جمع ہوتا ہے اور کبھی وہ زیرِ زمین جاکر کسی چٹان یا سخت روڑے کی وجہ سے سطح کے قریب ہی رک جاتا ہے اور مناسب راستہ پاکر چشموں کی صورت میں بہنے لگتا ہے۔ زمین کی ایک تیسری قسم ہے جو نہ خود پانی کو جذب کر کے روئیدگی دے سکتی ہے اور نہ کوئی آبی ذخیرہ محفوظ رکھ سکتی ہے۔ اس پتھریلی اور چٹیل زمین پر پانی برستا ہے اور ادھر ادھر بہہ جاتا ہے۔

ماہ صیام کی گھٹا سے جو بارانِ رحمت مہینہ بھر جاری رہی' اس کے متعلق آپ کیا محسوس کرتے ہیں کہ آپ کی قلب و روح کی کیفیت تین قسم کی زمینوں میں سے کس قسم کی رہی؟

ایک احتساب تو وہ تھا جسے پورے ماہ رمضان میں قیامِ لیل اور صیامِ نہار کے ساتھ جاری رہنا تھا کہ آیا روزے کی صحیح ہیئت کے ساتھ ساتھ اس کی صحیح روح بھی کام کر رہی ہے اور آیا پوری زندگی صبر و تقویٰ کے زیرِ اثر ہے؟ اور ایک احتساب اب ماہِ رمضان کے گزر جانے کے بعد کرنے کا ہے کہ ہم نے اس سے کیا استفادہ کیا؟ عارضی کیا؟ اور مستقل کیا؟

پہلا سوال

روزے آپ نے رکھے۔ خدا جزا دے۔ تراویح پڑھی' اللہ تعالیٰ قبول فرمائے' قرآن سے مشغولیت رہی' خدا آپ کو ایمانی نور عطا کرے۔ انفاق فی سبیل اللہ کیا' صاحب رزق برگ و بار ارزانی فرمائے۔ ان نیکیوں کے بعد بھی کچھ باتیں سوچنے کی ہیں۔

پہلا سوال یہ ہے کہ نفس کی جبلتوں' خواہشات اور ہیجانات پر قابو پاکر انھیں پابندِ حدود رکھنے کا جو تجربہ ہم آپ نے کیا ہے' اس کے نتیجے میں کیا ہم میں تھوڑی بہت مستقل یہ صلاحیت پیدا ہوئی یا نہیں کہ ہم مرضیاتِ الٰہی کے تحت نفس کو جب جس چیز سے چاہیں روک دیں اور کہہ دیں کہ خبردار! ادھر قدم نہیں بڑھانا اور جب مناسب سمجھیں اسے یہ اِذن دے دیں کہ اچھا فلاں امر میں فلاں حد تک جا سکتے ہو' آگے نہیں! ہم آپ نے اپنی ذات کی کمان کرنے کی صلاحیت پیدا کی؟ دنیا میں کوئی تبدیلی لانے اور دوسروں پر کمانڈ کرنے کی شرطِ اوّل دینِ حق میں یہ ہے کہ اپنی ذات کی گردن آدمی کے پنجے میں رہے اور وہ اسے سمتِ عبودیت سے پھرنے نہ دے۔ نیز کبرو غرور سے اکڑنے نہ دے۔

انسان کی جبلتیں اور ہیجانات بڑے بہیمانہ مزاج کے ہوتے ہیں' وہ کبھی کبھی ایک ایسا طوفان اٹھا دیتے ہیں کہ آدمی مقابلے میں قدم نہیں جما سکتا۔ عام قسم کے لوگ جن پر نہ ایمان کی گرفت ہو' نہ نماز روزے کی تربیتِ عمل سے وہ آشنا ہوں' ان کی تو زندگی ہی ادنیٰ ذاتی خواہشات کے دائرے میں گھومتی ہے۔ اور اس کے لیے وہ ہر طریقہ اختیار کر لیتے ہیں ـــــــ انسانوں کی اس قسم میں کتنے ہی عہدہ دار' تاجر' وکلا اور اعلیٰ تعلیم یافتہ اصحاب شامل ہوتے ہیں۔ دوسری قسم وہ ہے جو خدا کا ذکر بھی کرتی ہے' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے محبت بھی کرتی ہے' نماز کی بھی پابند ہے' روزے کا بھی اہتمام کرتی ہے' حج اور زکوٰۃ کے فرائض بھی پورے کرتی ہے۔ اور پھر نوافل اور صدقات اور سماجی خدمات کے سلسلے میں مقام رکھتی ہے۔ مگر اس مذہبی زندگی کے ساتھ اسراف' ریا' مشرکانہ طریقے' غیراسلامی رسوم' نا جائز سفارش بازی' رشوت کا لین دین' سودی معیشت ـــــــ کبھی کبھی اسمگلنگ' ذخیرہ اندوزی' چور بازاری جیسے کرتوت بھی اس کے ہاں پائے جاتے ہیں۔ یہ مریضانِ تضاد ہیں' اور انھوں نے دین کو سوجھ بوجھ اور سوچ بچار کے ساتھ قبول نہیں کیا' بلکہ خاندانی یا موروثی راستے سے یا تصوف کے کسی دائرے سے غیرشعوری طور پر اخذ کیا ہے۔

سوال ان سب کے لیے نہیں' یہ ہمارے آپ کے سوچنے کے لیے ہے کہ رمضان کے استاد

نے جو سبق دیا تھا اسے ہم نے کتنا یاد رکھا' اور کتنے کو عملی زندگی کا حصہ بنا لیا؟ کیا کوئی روکا ہوا حق ہم نے کسی کو ادا کیا؟ کیا کوئی مالِ حرام اپنے آپ سے الگ کیا؟ کیا کسی غیر قرآنی عقیدے اور کسی غیر اسلامی رسم اور کسی صریح بدعت کو چھوڑا؟ صدقہ و خیرات کا عالم کیا رہا۔ رمضان میں جو مصارف اٹھے اور پھر عید کے لیے جو رقم لگائی گئی اس کا کتواں حصہ خدا کی راہ میں خرچ ہوا؟ خدا کے دین کے لیے؟ اس کے بندوں کے لیے؟ مہاجرین کے لیے۔۔۔۔۔۔؟ کیا اقرباء اور رفقاء کے حلقوں میں کسی ٹوٹے رشتے کو بحال کر لیا؟ کوئی نفل' ذکر یا دعا' یا کوئی نیا سرمایہ خیر ہمارے معمولات میں شامل ہوا؟

رمضان نے ہمارا رشتہ خاص طور پر قرآن سے جوڑا تھا؟ تراویح میں قرآن سنایا گیا' روزہ داروں نے اپنے طور پر ختم قرآن کیا' قرآن کے درس کی محفلیں ہوئی ہوں گی' بہت سے حضرات نے استفادہ کیا ہو گا۔ اب یہ دور گزار کر احتساب کرنا چاہیے کہ کیا ہمارا تعلق قرآن کے ساتھ رمضان کے بعد باقی ہے؟ بعد میں بھی قرآن پڑھنے اور قرآن سننے کا سلسلہ جاری ہے؟ بعد میں بھی قرآن کے کسی حلقہ درس میں شرکت برقرار ہے؟ یا کم سے کم تفسیر و ترجمہ کا مطالعہ ہوتا ہے؟

اگر یہ چیزیں ہیں تو جتنی ہیں' اتنا فیضان آپ نے رمضان سے "مستقلاً" حاصل کر لیا۔

ایک اور سوال

دوسرا سوال یہ ہے کہ آپ کو جس بڑے کام کے لیے اٹھایا گیا ہے اور جس کے لیے نماز ہو یا ماہ رمضان کے روزے یا دوسری عبادات' سبھی کے اندر ذہنی و اخلاقی تربیت کا سامان رکھا گیا ہے' اس کام کے سلسلے میں کیا اقدام ہوا؟

ہماری کام اقامتِ دین کی مہم ہے جس کا پہلا سرا دعوتِ حق (امر بالمعروف اور نہی عن المنکر) ہے اور جس کا آخری سرا جہاد ہے' بلکہ یہ سلسلہ ہی جہاد ہے جس کا آغاز خدا پرستی کی طرف بلانے اور طاغوت سے روکنے سے ہوتا ہے' اور جس کی تکمیل خاک و خون سے تڑپ جانے سے ہوتی ہے۔

کیا آپ اس مہم کے سلسلے میں رمضان المبارک میں کبھی گھر سے نکلے؟ رشتہ داروں' دوستوں یا اجنبیوں سے کبھی کوئی باقاعدہ گفتگو کی؟ کسی کو کم سے کم روزہ داری کے لیے دعوت دی؟ تراویح کے لیے تیار کیا؟ کسی درسِ قرآن کے حلقے میں شرکت کی تلقین کی؟ اس بڑی دینی مہم کے لیے کبھی آپ نے اجتماعات کیے' اور ان میں مشورے سے کبھی لائحہ عمل تیار کیا؟

لوگوں سے ربط رکھنے کے سلسلے میں کیا کبھی مصیبت زدہ مخلوق کے قریب ہوئے؟ ان کے احوال سنے؟ ان کی مشکلات کے حل میں کوئی مدد بہم پہنچائی؟ مریضوں کی عیادت کی' یا ان کو کبھی دوا دارو کا انتظام کر دیا؟ کسی کو ہسپتال میں داخل کرایا؟ کسی ستم رسیدہ کو اپنے ہمدردانہ جذبات کے ذریعے سہارا دینے کی کوشش کی یا کسی کے لیے بطور خاص دعا کی؟ کسی کو ظلم سے بچانے کے لیے کوئی تدبیر اختیار کی؟

یہ رابطۂ عام اس دعوت کے لیے فضا کو تیار کرتا ہے جس پر آپ مامور ہیں؟

رمضان اور تحریکِ اقامتِ دین

اقامتِ دین کی مہم کے سلسلے کا ایک بڑا کام یہ ہے کہ ملک میں قیادت' حکومت کی مشینری اور اس کے مختلف ادارے' پرانے سیاسی لیڈر اور ان کے گروہ' مذہبی فرقے' خصوصاً" دینی اصول و اقدار میں فتنہ انگیزی کرنے والے خاص خاص عناصر' غیر مسلم اقلیتیں' مغرب پرست طبقے' پریس' ذرائع ابلاغ' بیرونی قوتیں جو جو کچھ کر رہی ہیں' ان پر نظر رکھی جائے۔ اور جو چیز دین کے حق میں جاتی ہوں' ان کی تائید کی جائے اور جو خلاف جاتی ہوں ان کی روک تھام کی جائے۔ اس کے لئے مطالعہ بھی کیا جائے' قلم سے بھی کام لیا جائے' گفتگوئیں بھی کی جائیں چھوٹی چھوٹی مجالس بھی منعقد ہوں۔ حالات کی جو بھی لہریں اٹھیں ان کے متعلق علمبردارانِ دینِ حق کو باخبر بھی ہونا چاہیے اور مخالفانہ رجحانات کا زور توڑنا بھی چاہیے۔

خاص طور پر جو مسائل جرائد میں زیرِ بحث آئیں یا جن کا عوام میں چرچا ہونے لگے' ان پر پوری ذہنی تیاری کر کے جرائد اور عوام کے حلقوں میں دو طرفہ کام کیا جائے۔

جس کسی میں سچا جذبۂ اقامتِ دین ہو گا' یقیناً" ماہ صیام نے اس کے جذبے کو نئی توانائی دی ہو گی۔ ایسا کوئی بھی شخص اگر پہلے اپنے فریضہ میں سُست گام بھی تھا تو اب اس کا ضمیر اسے پوری رفتار سے کام کرنے پر مجبور کر دے گا۔

یاد رکھیے کہ رمضان المبارک کو تحریکِ اقامتِ دین سے گہرا تعلق ہے۔ نزولِ قرآن کا مہینہ بھی ہے اور اولین معرکۂ حق و باطل بھی اسی مہینہ میں ہوا تھا' جس میں کثیر التعداد مخالفین کے مقابلے میں مسلمانوں کا مختصر گروہ کامیاب رہا۔

ایک اور مسئلہ

رمضان میں شیطان زنجیروں میں جکڑا جاتا ہے' مگر شیاطین الانس کے ذہن و اخلاق کو شیطانی

قوتیں اتنا بگاڑ دیتی ہیں کہ وہ شیطنت کے رنگ میں رنگ جاتے ہیں اور پھر اس رنگ کو پھیلانے کے لیے طرح طرح سے کام کرتے ہیں، ان کے خلاف آپ نے کس حد تک کام کیا؟

زندگی کے باطل اور فاسد نظریات جو دینِ حق سے ٹکراتے ہیں، ان کا زہر ہمارے معاشرے میں علم، تعلیم، ادب، صحافت، شاعری، ثقافت، اشتہارات اور ذرائع ابلاغ کے غلط استعمال کے ذریعے پھیلایا جا رہا ہے۔ اس زہر کا توڑ کرنے کے لیے آپ نے مختلف میدانوں میں خصوصاً اس خاص میدان میں جس میں آپ کی براہ راست ذمہ داری ہے، کیا کام کیا؟

دولت پرستی، اسراف مستی، اور جرم و خیانت اور بے حیائی اور بے پردگی کے امڈتے طوفان کو آپ دیکھ رہے ہیں، کیا رمضان کی مقدس فضاؤں میں آپ کے اندر ایسا جذبہ حق بیدار ہوا کہ جہاں تک ممکن ہو آپ ان مفاسد کے خلاف کام کریں، اور انھیں تو اپنے گھر کے افراد میں اپنے محبوں اور عزیزوں میں اور زیر اثر حلقوں میں دین کے اثرات بڑھائیں۔ آپ کم سے کم یہ فیصلہ تو کر لیں کہ بچوں کے رشتے کرتے ہوئے ایمان، اخلاق اور پردہ داری کو آپ اولین اہمیت دیں گے اور اس کے لیے اپنے بچوں اور گھر والوں کے اذہان کو تیار کریں۔

بہر حال بڑا شیطان عارضی طور پر جکڑا پڑا رہا ہے۔ مگر خود انسانوں میں اس کے کارندے بے شمار ہیں اور وہ فکر، اخلاق، معاشرت، ثقافت، لین دین، دفتری نظام کے تمام دائروں میں کام کر رہے ہیں۔ ان کے بارے میں ہم لوگوں کو کہاں تک احساس ہے؟

مزید سوال

ایک ذمہ داری ہم پر ان مسلمان مجاہدین کی ہے جو عالم اسلام میں آزادی اور اسلام کے لیے برسرِ پیکار ہیں۔ خصوصاً اہل کشمیر، اہل افغانستان، اہل فلسطین، نیز باشندگان الجزائر اور مہاجرین افغانستان کے متعلق ہمارا بڑا امتحان ہے۔

مصیبت میں گھرے ہوئے ان مسلم مجاہدین و مہاجرین سے محبت کرنا اور ان کے لیے اپنے اموال میں سے حصہ نکال کر قربانی دینا عین اسلام کا تقاضا ہے۔

کیا رمضان جیسے ماہ مقدس نے مجاہدین و مہاجرین کے متعلق آپ میں جذبہ تو ابھارا؟ اور آپ نے ان کے لیے رمضان میں یا عید پر، یا اب رمضان کے بعد کے دنوں میں کوئی غیر معمولی ایثار کیا ہے؟ رمضان کی برکات میں سے ایک یہ ہے کہ وہ جذبۂ انفاق کو بیدار اور متحرک کرتا ہے؟ تو آپ کے جذبہ انفاق میں سے کوئی حصہ افغان مہاجرین کو بھی ملا؟

میری دعا ہے کہ اپنے اپنے اس احتسابِ نفس کے نتیجے میں ایسے حقائق سامنے آئیں کہ

ہمارے قلوب مطمئن ہوں اور آخرت میں خدا کے ہاں ہمیں اس پرچے پر زیادہ سے زیادہ نمبر ملیں! آمین۔

ہماری عید کا مرکزی جوہر نماز اور صدقہ فطر اور تکبیرات ہیں۔ یہ ہماری مخصوص اسلامی تہذیب ہے کہ ہم یوم مسرت بھی مناتے ہیں تو خدا فراموشی کی کیفیت نہیں ہوتی۔ ہم ایک لمبے دورِ عبادت کی آزمائش و تربیت کے دور سے کامیابی کے ساتھ گزرنے پر خدا کے شکر کے طور پر عید الفطر مناتے ہیں۔ ہرچند کہ اچھے کپڑے پہننے اور اچھے کھانے کھانے اور عزیزوں دوستوں سے میل ملاقات اور بچوں کی تفریح اور جائز قسم کے کھیل تماشوں کی گنجائش دی گئی ہے۔ مگر عید الفطر کو کسی ایسے طریق سے نہیں منانا چاہیے کہ روزے رکھ کر اور تراویح پڑھ کر اور قرآن مجید کی تلاوت کر کے اور صدقہ و خیرات کر کے جو کردار پیدا کیا گیا ہو' اسے طوفانِ مسرت میں ڈبو دیا جائے' اور پھر سارا سال اس طرح گزرے کہ نہ خدا کا خوف' نہ رسولؐ کی محبت اور نہ آخرت کے حساب کتاب کا تصور۔ بس جہاز عمر رواں پر سوار نجانے کدھر سے کدھر جا رہے ہیں۔

عید اس طرح منانی چاہیے کہ ماہ صیام کی برکات ہمارے ساتھ رہیں اور سارا سال ہمارے لیے زادِ راہ بنی رہیں۔

بقیہ: حکمت مودودیؒ

داری کے خلاف ہیں۔ اب آپ کی یہ خواہش کہ آپ قوانینِ اسلامی کی خلاف ورزی بھی کریں' نظامِ سرمایہ داری کی پیروی بھی کریں اور اسلام کی نظر میں گنہگار بھی نہ ہوں درحقیقت یہ معنی رکھتی ہے کہ اسلام کی پیروی چھوڑ کر آپ خود اسلام کو خود اپنا پیرو بنانا چاہتے ہیں اور آپ کی خواہش یہ ہے کہ وہ محض آپ کو اپنے دائرہ میں رکھنے کی خاطر اپنے اصول بدل کر سرمایہ دارانہ نظم معیشت کے اصول اختیار کر لے۔

(اخذ و ترتیب: صلاح الدین کاشمیری)

خصوصی تجزیہ

نفاذِ شریعت ایکٹ پر اعتراضات کا
----ایک علمی محاکمہ----

پروفیسر خورشید احمد

قسط (۴)

اسلامی ریاست ' نفاذِ شریعت اور قائد اعظمؒ

آخر میں ہم قائد اعظمؒ ' اسلامی قانون و ریاست اور تھیو کریسی کے بارے میں کچھ گزارشات کرنا چاہتے ہیں ' ان امور پر انگریزی اخبارات و رسائل اور خود پارلیمنٹ کی بحث میں چند ارکان نے بہت کچھ زہر اگلا ہے اور ایسے دعوے کیے گئے ہیں جن کا ذکر ضروری ہے۔

اس سلسلہ میں پہلی بات تو یہ کہی گئی ہے کہ قائد اعظمؒ اسلامی ریاست کے قیام کے مخالف تھے۔ وہ چاہتے تھے کہ پاکستان کو ایک سیکولر ریاست بنایا جائے جب کہ شریعت کی بالادستی کی بات ہی کبھی نہیں کی ' بلکہ وہ تھیو کریسی یعنی اسلامی ریاست کے مخالف تھے۔ وہ چاہتے تھے کہ پاکستان کو ایک سیکولر ریاست بنایا جائے جب کہ شریعت ایکٹ اسے ایک "تھیو کریسی" میں تبدیل کر دے گا۔

یہ بات صرف وہی افراد کہہ سکتے ہیں جو یا تو قائد اعظمؒ کے افکار و اعلانات اور ان وعدوں سے واقف نہیں جو انھوں نے ۱۹۴۰ء سے لے کر اپنے آخری خطاب جولائی ۱۹۴۹ء تک قوم سے بار بار کیے۔ یا پھر وہ قائد اعظمؒ کے نام پر لوگوں کو دھوکا دینا چاہتے ہیں ' خود قائد اعظمؒ پر دوغلے پن اور دھوکہ دہی کا الزام لگانا چاہتے ہیں۔

قائد اعظمؒ نے مارچ ۱۹۴۱ء میں فرمایا:

"ہندوستان کی تقسیم اس لیے ضروری ہے کہ دونوں قومیں اپنے اپنے مزاج و مذاق کے

مطابق معیشت ' معاشرت ' ثقافت اور سیاحت میں آزادانہ طور پر زیادہ سے زیادہ ترقی کر سکیں۔ یہ ساری جدوجہد اس لیے ہے کہ اس کے پورے پورے مواقع حاصل ہوں اور مسلمان اپنے قومی عزائم کو بروئے کار لا سکیں۔ ہم جس اہم نزاع میں مبتلا ہیں وہ صرف مادی فوائد کے لیے نہیں بلکہ فی الحقیقت مسلم قوم کی روح کی بقاء کے لیے ہے۔"

مارچ ۱۹۴۴ء میں آپ نے فرمایا۔ "ہمارا یہ اعتقاد ہے اور ہم اس کے مضبوطی سے قائل ہیں کہ ہندو اور مسلمان قومیت کے ہر تصور اور معیار کی رو سے دو قومیں ہیں۔ ہم دس کروڑ (مسلمان) ایک طرف ہیں ' جو اپنی تہذیب ' اپنی ثقافت ' زبان ادب ' طبعی صلاحیتوں اور امنگوں کے اعتبار سے ایک قوم ہیں۔ مختصر یہ کہ زندگی کے متعلق ہمارا ایک امتیازی نظریہ اور تصور ہے ' اور قومیت کے ہر بین الاقوامی معیار کی رو سے ہم ایک قوم ہیں۔"

جون ۱۹۴۵ء میں قائد اعظمؒ نے فرمایا '

"پاکستان کا منشاء و مقصد صرف آزادی و خود مختاری ہی نہیں بلکہ اسلامی نظریہ ہے ' جو ایک بیش بہا عطیے و خزانے کی حیثیت سے ہم تک پہنچا ہے۔ جسے ہمیں قائم و برقرار رکھنا ہے۔ اور جس کی بابت ہمیں توقع ہے کہ دوسرے بھی اس سے متمتع ہوں گے۔"

نومبر ۱۹۴۵ء میں کہا '

"مسلمان پاکستان کا مطالبہ کرتے ہیں تاکہ وہ اپنے ضابطۂ حیات ' اپنی روایات اور اسلامی قوانین کے مطابق حکومت کر سکیں۔ ہمارا مذہب ' ہمارا کلچر اور ہمارے اسلامی نظریات ہی وہ محرکات ہیں جو ہمیں خود مختاری حاصل کرنے کے لیے آگے بڑھاتے ہیں۔"

اور صاف الفاظ میں اسلامی قوانین کے نفاذ کی بات دسمبر ۱۹۴۵ء میں اس طرح کی '

"لیگ اس بات کی دعویدار ہے کہ ہندوستان کے ان علاقوں میں جہاں مسلمان تعداد کے لحاظ سے اکثریت میں ہیں ایسی مملکت قائم کریں جہاں وہ اسلامی قوانین کے تحت حکومت کر سکیں۔"

کیا کوئی صاحب عقل سمجھ سکتا ہے کہ محض تقسیم ملک سے یہ سارے اختلافات اور مسلمانوں کی یہ ساری خصوصیات یک سر ختم ہو گئیں۔ ایک اور آسمانی انقلاب کے ذریعہ وہی قوم چشم زدن میں وطنی قومیت کی علمبردار بن گئی ؟ یہی وجہ ہے کہ تقسیم کے بعد قائد اعظمؒ نے صاف الفاظ میں کہا :

"پاکستان کا قیام جس کے لیے ہم دس سال سے کوشاں تھے ' بفضلہ تعالیٰ اب ایک زندہ

حقیقت ہے۔ لیکن خود اپنی مملکت کا قیام ہمارے مقصد کا صرف ایک ذریعہ تھا اصل مقصد نہیں تھا۔ اصل مقصد یہ تھا کہ ایک ایسی مملکت قائم ہو جہاں ہم آزاد انسانوں کی طرح رہیں جس کو ہم اپنے مزاج اور اپنی ثقافت کے مطابق ترقی دیں اور جس میں اسلامی عدل اجتماعی کے اصول آزادی کے ساتھ نافذ و جاری ہوں"۔ (اکتوبر ۱۹۴۷ء)

"صرف یہی نہیں کہ ہم میں سے اکثر مسلمان ہیں، بلکہ ہماری اپنی تاریخ ہے، اپنے رسم و رواج ہیں، اپنی روایات ہیں، اپنا اندازِ فکر ہے، اور اپنا ایک مخصوص رجحان ہے، جس سے احساسِ قومیت پیدا ہوتا ہے۔ ہماری تمنا ہے کہ ہم سکون کے ساتھ اپنے انداز پر مستقبل کی صورت گری کریں اور دنیا کے معاملات میں اپنے حق کے مطابق حصہ لیں"۔ (فروری ۱۹۴۸ء)

مارچ ۱۹۴۸ء میں، کہا کہ

"پاکستان مسلم قوم کے اتحاد کا مظہر ہے اور اس کی یہی حیثیت باقی رہنی چاہیے، اور بحیثیت سچے مسلمان کے ہمیں پوری طرح اس اتحاد کی حفاظت کرنی چاہیے، اسے قائم و برقرار رکھنا چاہیے۔"

اور فروری ۱۹۴۸ء میں بڑے واشگاف انداز میں میلاد النبیؐ کے موقع پر اپنے اس عزم کا اظہار فرمایا:

"اس سکیم کو پیش کرنے میں ایک بنیادی اصول میرے پیش نظر تھا۔ یعنی اسلامی جمہوریت کا اصول۔ میرا یہ ایمان ہے کہ ہماری نجات اسی میں مضمر ہے کہ ہم ان بیش بہا اصولوں کی پیروی کریں جو ہمارے عظیم المرتبت قانون دہندہ (Law Giver) پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمارے لیے وضع کیے تھے۔ آیئے ہم اپنی جمہوریہ کی اساس سچے اسلامی تصورات اور اصولوں پر قائم کریں۔ ہمارے اللہ نے ہمیں حکم دیا ہے کہ ہم اپنے امور حکومت باہمی مشورے سے طے کیا کریں۔"

یہ تھا قائد اعظمؒ کا تصورِ پاکستان۔ اور یہی وہ تصور پاکستان ہے جس کی دعوت پر مسلمانوں نے لبیک کہا اور ہر قسم کی قربانی دے کر اس ملک کو حاصل کیا۔ سات سال تک مسلمانوں نے شب و روز اس مقصد کے لیے کوشش کی۔ ہزاروں انسانوں نے اپنی جانیں اس کی راہ میں نذر کر دیں۔ لاکھوں انسانوں نے گھر بار لٹا دیا اور اپنے وطن تک کو چھوڑ دیا۔ ہزاروں عورتوں نے اس کی قیمت اپنی عصمت کی بربادی کی شکل میں ادا کی۔ اور یہ سب کچھ صرف ایک مقصد کے لیے تھا۔ یعنی اسلامی ریاست کا قیام۔ اسی تصور کو قائد اعظمؒ نے پیش کیا اور آخر وقت تک وہ

اسی کے لیے کوشاں رہے ۔ قائد اعظم ؒ کو لادینی تصور ریاست کا علمبردار قرار دینا اس صدی کا سب سے بڑا جھوٹ اور قائد مرحوم پر سب سے زیادہ شرمناک حملہ اور بہتان ہے۔

جو حضرات یہ کہتے ہیں کہ عین صبح تقسیم قائد اعظمؒ لادینی ریاست کے ہم نوا ہو گئے تھے وہ قائد اعظمؒ پر بڑے گھناؤنے الزام عائد کرتے ہیں ۔ اس لئے کہ ان کا یہ دعویٰ دو ہی صورتوں میں درست ہو سکتا ہے یعنی :

(ا) یا تو (خدا نخواستہ) قائد اعظم منافق ' جھوٹے اور ابن الوقت تھے کہ ایک مہم میں کامیاب ہونے کے لیے مسلمانوں کو دھوکا دیا ' ان سے جھوٹے وعدے کیے اور جب اس مقصد میں کامیابی ہو گئی ' تو پہلے ہی دن ' بلکہ ۱۴ اگست کو زمام اقتدار سنبھالنے سے بھی ۳ دن پہلے ہی ' اپنے وعدوں سے مکر گئے اور جس اصول کی خاطر اپنی ساری قوت صرف کی تھی کامیابی کی پہلی ہی جھلک پر اسے اپنے ہی ہاتھوں دفن کر دیا ——— اور یہ وہ بات ہے جو قائد اعظمؒ کے بڑے سے بڑے مخالف بھی ان کے متعلق نہیں کہہ سکے ۔ اس لیے کہ وہ ایک با اصول انسان تھے ' اور جو بات وہ زبان سے کہا کرتے تھے وہی ان کے دل میں ہوا کرتی تھی ' محض مقصد براری کے لیے انہوں نے کبھی دوسروں کو نہ غلط فہمی میں رکھا اور نہ دھوکا دیا۔

(ب) یا پھر قائد اعظمؒ ذہنی انتشار اور فکری ژولیدگی میں مبتلا تھے ' اور متضاد باتیں کہنے کے عادی تھے ۔ کبھی لادینیت کی ہمنوائی کرتے تھے اور کبھی اسلامی ریاست کی علمبرداری ——— اور یہ بھی ایک ایسی بات ہے جو قائد اعظمؒ کے دشمن بھی ان کے متعلق نہیں کہہ سکتے۔ لیکن افسوس ہے کہ آج کچھ ایسے افراد بھی ہیں جو اپنے آپ کو قائد اعظمؒ کا پیرو کہتے ہیں ' جو اس جماعت سے وابستگی کا دعویٰ کرتے ہیں جس نے قائد اعظمؒ کی قیادت میں پاکستان کی منزل سر کی تھی ' لیکن قائد اعظمؒ کے افکار کی جو تعبیر وہ پیش کر رہے ہیں اس سے بڑی زیادتی قائد مرحوم کے ساتھ نہیں کی جا سکتی ۔ یہ لوگ ان کی طرف وہ باتیں منسوب کر رہے ہیں جن سے قائد کی تصویر ہی بگڑ جاتی ہے ' اور ان کی ساری عظمت خاک میں مل جاتی ہے ۔ اس سے بڑی زیادتی قائد اعظمؒ کے ساتھ اور کیا ہو سکتی ہے ؟ اس سے زیادہ برا خراج ان کو اور کونسا پیش کیا جا سکتا ہے ؟ ان کو بدنام کرنے اور ان کی سیرت کو داغدار بنانے کا اس سے کامیاب حربہ اور کونسا ہو سکتا ہے ؟ مسلمانوں کی نگاہوں میں ان کی وقعت و عظمت کو گرانے کا اس سے بدتر طریقہ اور کون سا ہو سکتا ہے ؟ آج قائد اعظمؒ کی روح شدید کرب میں مبتلا ہے اور زبان حال سے گویا ہے۔

مجھے میرے دوستوں سے بچاؤ!

لیکن ایک بنیادی سوال ضرور غور طلب ہے۔ یعنی قائد اعظمؒ کی ۱۱؍ اگست ۱۹۴۷ء والی تقریر کا منشا کیا تھا؟ اس کے متعلق ہماری معروضات یہ ہیں۔

۱۔ وہ تقریر جس فضا میں کی گئی اسے نظرانداز کر کے اسے سمجھا ہی نہیں جا سکتا۔ اگست ۱۹۴۷ء کا مہینہ شدید کشت و خون کا مہینہ تھا۔ ہر طرف قتل و غارت گری کا بازار گرم تھا۔ ہندوستان میں مسلمان خون میں نہلائے جا رہے تھے۔ پاکستان میں بھی ناسمجھ عناصر ہندوؤں کے ظلم کا بدلہ یہاں کے غیر مسلموں سے لے رہے تھے۔ فضا میں تکدر اور بڑا شدید کھچاؤ تھا۔ ایسے موقعہ پر اعتماد کی فضا کو بحال کرنے کے لیے قائد اعظمؒ نے اقلیتوں کو آزادی اور حفاظت کی ضمانت دی' اور کہا کہ مذہب کے اختلافات کی بناء پر ان سے کوئی امتیاز نہیں برتا جائے گا اور ان کے جائز حقوق ان کو ہر حالت میں دیئے جائیں گے۔ اور یہ بات مخصوص حالات کی بناء پر آپ نے ایک خاص اہمیت کے ساتھ کہی۔ بلکہ اس خاص پس منظر میں مبالغہ ہوتا تو وہ بھی قابلِ فہم ہوتا۔

۲۔ دوسری بڑی بنیادی بات یہ ہے کہ آپ نے ساری اہمیت اس بات کو دی کہ مسلمان' عیسائی اور ہندو برابر کے شہری ہوں گے۔ برابر کے شہری ہونے سے یہ بات ہرگز لازم نہیں آتی کہ ریاست کا کوئی نظریہ نہیں ہو گا' یا یہ کہ اسلام کا رہنما اصول نہ ہو گا' اور ملک اور اس کا قانون اسلامی قانون نہ ہو گا۔ یہ بات محض "جدید مفسرین" کا اضافہ ہے۔ قائد اعظمؒ نے یہ نہیں کہا تھا۔ علمِ سیاست کے طالب علم بھی اس بات سے واقف ہیں کہ شہریت اور چیز ہے' اور قومیت اور۔ نیز غیر مسلموں کے شہریت میں برابر کے شریک ہونے کے یہ معنی ہرگز نہیں کہ اکثریت کی آئیڈیالوجی ہی پر خط تنسیخ پھیر دیا جائے گا۔

۳۔ اسی طرح یہ بات بھی ملحوظ رہے کہ الفاظ "کاروبار سلطنت" (Business of the State) کے استعمال ہوئے ہیں' "نظریہ ریاست" Idealogy of the State " یا "اساس سلطنت" (Basis of State) کے نہیں۔ "کاروبار سلطنت" ایک انتظامی تصور ہے اور سیاق و سباق سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ اس سے مراد ریاست کا ایڈمنسٹریشن ہے نہ کہ اس کا مقصد' ------ نظریہ اور رہنمائی کے اصول' اس کی وضاحت ان کے اس جملے سے ہو جاتی ہے کہ "مذہبی امور دینی معنی میں نہیں' بلکہ صرف سیاسی مفہوم میں۔ یعنی ریاست کے عام شہریوں کی حیثیت سے (ان میں کوئی فرق نہ برتا جائے گا)"...... اس لیے جہاں تک خود اس تقریر کے غیر متعصبانہ اور متعین معاملہ میں ان کی رائے کے اظہار کی حیثیت رکھتی

ہے۔

۴ - پھر ایک شخص کے خیالات کو کسی ایک اقتباس سے کبھی نہیں سمجھا جا سکتا۔ اس کی پوری فکر' اس کی تمام تصریحات کے پس منظر میں ان کی اس تقریر کا مطالعہ کیا جائے تو پھر کوئی غلط فہمی نہیں رہتی۔ تعبیر کی گمراہیاں پیدا ہی اس بناء پر ہوتی ہیں کہ صرف ایک پیراگراف کو مقرر کی عمومی فکر سے کاٹ کر دیکھا جاتا ہے اس طرح (غلط تعبیر) کا رونما ہونا بالکل فطری ہے۔ صحیح طریقہ یہی ہے کہ ایک شخص کی تمام فکر کو سامنے رکھیے اور پھر کوئی نتیجہ نکالیے' اگر کوئی شخص ایسا نہیں کرتا تو اس کے صاف معنی یہ ہیں کہ وہ حق کا طالب نہیں بلکہ اپنے مخصوص نظریات کی خاطر دوسروں کے خیالات کا استحصال (Exploitation) کرنا چاہتا ہے اور قائد اعظم" تو بیچارے ایک انسان ہی ہیں' اس مکروہ مقصد کے لیے تو لوگ قرآن پاک تک کو نہیں چھوڑتے۔

"خود بدلتے نہیں قرآں کو بدل دیتے ہیں"

بقیہ مطبوعات

سے پہلے اس مقالے کا ذکر کیا ہے جو ڈاکٹریٹ کے سلسلے میں طالب علمانہ ضرورت کے تحت ۱۹۰۵ اور ۱۹۰۸ کے درمیان لکھا گیا اور جس کا عنوان تھا "ایران میں مابعدالطبیعات کا ارتقا"۔ اسی پر علامہ کو ڈاکٹر آف لا کی ڈگری ملی۔ یہ مقالہ گویا ایک کتاب میں ثنویت' زرتشت' مزدک' ابن مسکویہ' بو علی سینا' اعتزال' یوسف البصیر' ابوہاشم' نظام' ابوالقاسم' تشکیک' اسمٰعیلیت' حروفیت' اشعریت' رازی' ابومنصور' ماتریدی' باقلانی' غزالی' فروغِ تصوف کے ۶ اسباب' اشراقیت' شیخ شہاب الدین سہروردی' الجیلی' ان سارے افراد اور مسائل اور موضوعات پر بہت اچھی معلومات سامنے آجاتی ہیں۔

پھر ڈاکٹر عبدالمغنی صاحب نے "اسلام میں مذہبی فکر کی تشکیل جدید" کے ایک ایک انگریزی خطبے کا مختصر مفہوم واضح کیا ہے بلکہ جہاں جہاں غلط اندیشیوں کے لیے کوئی رخنہ موجود تھا' وہاں بات صاف کر دی ہے۔

باتیں اور بھی ہیں مگر یہ نوٹ طویل ہو رہا ہے' لٰہذا کتاب کی جس حد تک تصویر کشی کی گئی ہے' وہ یہ احساس دلانے کے لیے کافی ہے کہ دنیائے اقبال شناسی میں اسے ایک اہم مقام حاصل ہونا چاہیے اور اساتذہ و طلبہ' صحافیوں اور ادیبوں اور علما اور دانشوروں کو اس کا بغور مطالعہ کرنا چاہیے۔

علامہ اقبالؒ ـــــ شخصیت اور کارنامہ

سید ابو الاعلیٰ مودودیؒ

(۱)

سب جانتے ہیں کہ اقبال نے یہی مغربی تعلیم حاصل کی تھی جو ہمارے نوجوان انگریزی یونیورسٹیوں میں حاصل کرتے ہیں۔ یہی تاریخ' یہی ادب' یہی اقتصادیات' یہی سیاسیات' یہی قانون اور یہی فلسفہ انہوں نے بھی پڑھا تھا اور ان فنون میں بھی وہ مبتدی نہ تھے بلکہ منتہی فارغ التحصیل تھے۔ خصوصاً فلسفہ میں تو ان کو امامت کا مرتبہ حاصل تھا جس کا اعتراف موجودہ دور کے اکابر فلاسفر تک کر چکے ہیں۔ جس شراب کے دو چار گھونٹ پی کر بہت سے لوگ بہکنے لگتے ہیں یہ مرحوم اس کے سمندر پیے بیٹھا تھا۔ پھر مغرب اور اس کی تہذیب کو بھی اس نے محض ساحل پر سے نہیں دیکھا تھا' جس طرح ہمارے ۹۹ فیصدی نوجوان دیکھتے ہیں بلکہ وہ اس دریا میں غوطہ لگا کر تہ تک اتر چکا تھا' اور ان سب مرحلوں سے گزرا تھا جن میں پہنچ کر ہماری قوم کے ہزاروں نوجوان اپنے دین و ایمان' اپنے اصول تہذیب و تمدن اور اپنے قومی اخلاق کے مبادی تک سے برگشتہ ہو جاتے ہیں۔ حتیٰ کہ اپنی قومی زبان تک بولنے کے قابل نہیں رہتے۔

لیکن اس کے باوجود اس شخص کا حال کیسا تھا؟ مغربی تعلیم و تہذیب کے سمندر میں قدم رکھتے وقت وہ جتنا مسلمان تھا' اس کے منجدھار میں پہنچ کر اس سے زیادہ مسلمان پایا گیا۔ اس کی گہرائیوں میں جتنا اترتا گیا اتنا ہی زیادہ مسلمان ہوتا گیا۔ یہاں تک کہ اس کی تہ میں جب پہنچا تو دنیا نے دیکھا کہ وہ قرآن میں گم ہو چکا ہے اور قرآن سے الگ اس کا کوئی فکری وجود باقی ہی نہیں رہا۔ وہ جو کچھ سوچتا تھا قرآنی دماغ سے سوچتا تھا۔ جو کچھ دیکھتا تھا' قرآن کی نظر سے دیکھتا تھا۔ حقیقت اور قرآن اس کے نزدیک شے واحد تھے' اور اس شے واحد میں وہ اس طرح فنا ہو گیا تھا کہ اس کے دور کے علمائے دین میں بھی مجھے کوئی ایسا شخص نظر نہیں آتا جو فنائیت فی

القرآن میں اس امامِ فلسفہ اور اس ایم اے پی ایچ ڈی بار ایٹ لاء سے لگا کھاتا ہو۔

بہت کم لوگوں کو معلوم ہے کہ آخری دور میں اقبال نے تمام کتابوں کو الگ کر دیا تھا اور سوائے قرآن کے ' اور کوئی کتاب وہ اپنے سامنے نہ رکھتے تھے۔ سالہا سال تک علوم و فنون کے دفتروں میں غرق رہنے کے بعد جس نتیجہ پر پہنچے تھے ' وہ یہ تھا کہ اصل علم قرآن ہے اور یہ جس کے ہاتھ آجائے وہ دنیا کی تمام کتابوں سے بے نیاز ہے۔ ایک مرتبہ کسی شخص نے ان کے پاس فلسفہ کے چند اہم سوالات بھیجے ' اور ان کا جواب مانگا۔ ان کے قریب رہنے والے لوگ متوقع تھے ' کہ اب علامہ اپنی لائبریری کی الماری کھلوائیں گے۔ اور بڑی بڑی کتابیں نکلوا کر ان مسائل کا حل تلاش کریں گے ' مگر وہ یہ دیکھ کر حیران رہ گئے۔ کہ لائبریری کی الماریاں مقفل کی مقفل رہیں ' اور وہ صرف قرآن ہاتھ میں لے کر جواب لکھنے بیٹھ گئے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات مبارک کے ساتھ ان کی والہانہ عقیدت کا حال اکثر لوگوں کو معلوم ہے ' مگر یہ شائد کسی کو نہیں معلوم کہ انہوں نے اپنے سارے تفلسف اور اپنی تمام عقلیت کو رسول عربی کے قدموں میں ایک متاع حقیر کی طرح نذر کر کے رکھ دیا تھا۔ حدیث کی جن باتوں پر نئے تعلیم یافتہ نہیں پرانے مولوی تک کان کھڑے کرتے ہیں۔ اور پہلو بدل بدل کر تاویلیں کرنے لگتے ہیں۔ یہ ڈاکٹر آف فلاسفی ان کے ٹھیٹھ لفظی مفہوم پر ایمان رکھتا تھا۔ اور ایسی کوئی حدیث سن کر ایک لمحہ کے لیے بھی اس کے دل میں شک کا گزر نہ ہوتا تھا۔ ایک مرتبہ ایک صاحب نے ان کے سامنے بڑے اچنبھے کے انداز میں اس حدیث کا ذکر کیا جس میں بیان ہوا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اصحاب ثلاثہ کے ساتھ کوہ احد پر تشریف رکھتے تھے۔ اتنے میں احد لرزنے لگا ' اور حضورؐ نے فرمایا کہ ٹھہر جا تیرے اوپر ایک نبی ' ایک صدیق اور دو شہیدوں کے سوا کوئی نہیں ہے۔ اس پر پہاڑ ساکن ہو گیا۔

اقبال نے حدیث سنتے ہی کہا کہ اس میں اچنبھے کی کونسی بات ہے ؟ میں اس کو استعارہ و مجاز نہیں بالکل ایک مادی حقیقت سمجھتا ہوں ' اور میرے نزدیک اس کے لیے کسی تاویل کی حاجت نہیں ' اگر تم حقائق سے آگاہ ہوتے تو تمہیں معلوم ہوتا کہ ایک نبی کے نیچے آکر مادے کے بڑے سے بڑے تودے بھی لرز اٹھتے ہیں ' مجازی طور پر نہیں واقعی لرز اٹھتے ہیں۔

اسلامی شریعت کے جن احکام کو بہت سے روشن خیال حضرات فرسودہ اور بوسیدہ قوانین سمجھتے ہیں۔ اور جن پر اعتقاد رکھنا ان کے نزدیک ایسی تاریک خیالی ہے۔ کہ مہذب سوسائٹی میں ان کی تائید کرنا ایک تعلیم یافتہ آدمی کے لیے ڈوب مرنے سے زیادہ بدتر ہے۔ اقبال نہ

صرف ان کو مانتا اور ان پر عمل کرتا تھا بلکہ برملا ان کی حمایت کرتا تھا۔ اور اس کو کسی کے سامنے ان کی تائید کرنے میں باک نہ تھا۔ ان کی ایک معمولی مثال سن لیجئے۔ ایک مرتبہ حکومت ہند نے ان کو جنوبی افریقہ میں اپنا ایجنٹ بنا کر بھیجنا چاہا۔ اور یہ عہدہ ان کے سامنے باقاعدہ پیش کیا، مگر شرط یہ تھی۔ کہ وہ اپنی بیوی کو پردہ نہ کرائیں گے۔ اور سرکاری تقریبات میں لیڈی اقبال کو ساتھ لے کر شریک ہوا کریں گے۔ اقبال نے اس شرط کے ساتھ یہ عہدہ قبول کرنے سے صاف انکار کر دیا، اور خود لارڈ ولنگڈن کو کہا کہ میں بے شک ایک گناہ گار آدمی ہوں احکام اسلامی کی پابندی میں بہت کوتاہیاں مجھ سے ہوتی ہیں، مگر اتنی ذلت اختیار نہیں کر سکتا۔ کہ محض آپ کا عہدہ حاصل کرنے کے لیے شریعت کے حکم کو توڑ دوں۔

اقبال کے متعلق عام خیال یہ ہے۔ کہ وہ فقط اعتقادی مسلمان تھے۔ عمل سے ان کو کچھ سروکار نہ تھا۔ اس بدگمانی پیدا کرنے میں خود ان کی افتاد طبیعت کا بھی بہت کچھ دخل ہے۔ ان میں کچھ فرقہ ملامتیہ کے سے میلانات تھے، جن کی بناء پر اپنی رندی کے اشتہار دینے میں انھیں کچھ مزا آتا تھا۔ ورنہ درحقیقت وہ اتنے بے عمل نہ تھے۔

قرآن مجید کی تلاوت سے ان کو خاص شغف تھا۔ اور صبح کے وقت بڑی خوش الحانی کے ساتھ پڑھا کرتے تھے۔ مگر اخیر زمانے میں طبیعت کی رقت کا یہ حال ہو گیا تھا۔ کہ تلاوت کے دوران میں روتے روتے ہچکیاں بندھ جاتی تھیں۔ اور مسلسل پڑھ ہی نہ سکتے تھے۔ نماز بھی بڑے خشوع و خضوع سے پڑھتے تھے۔ مگر چھپ کر۔ ظاہر میں یہی اعلان تھا۔ گو نرا گفتار کا غازی ہوں۔

ان کی سادہ زندگی اور فقیرانہ طبیعت کے حالات ان کی وفات ہی کے بعد لوگوں میں شائع ہوئے۔ ورنہ عام خیال یہی تھا۔ کہ جیسے اور "سر صاحبان" ہوتے ہیں۔ ویسے ہی وہ بھی ہوں گے، اور اسی بناء پر بہت سے لوگوں نے یہاں تک بلا تحقیق لکھ ڈالا تھا۔ کہ ان کی بارگاہ عالی تک رسائی کہاں ہوتی ہے۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ یہ محض حقیقت میں اس سے بھی زیادہ فقیر منش تھا۔ جتنا اس کی وفات کے بعد لوگوں نے اخبارات میں بیان کیا ہے۔ ایک مرتبہ کا واقعہ سن لیجئے۔ جس سے اس نائٹ اور بیرسٹر کی طبیعت کا آپ اندازہ کر سکیں گے۔ پنجاب کے ایک دولت مند رئیس نے ایک قانونی مشورہ کے لیے اقبال اور سر فضل حسین مرحوم اور ایک دو اور مشہور قانون داں اصحاب کو اپنے ہاں بلایا۔ اور اپنی شاندار کوٹھی میں ان کے قیام کا انتظام کیا۔ رات کو جس وقت اقبال اپنے کمرے میں آرام کرنے کے لیے گئے۔ تو ہر طرف عیش و تنعم

کے سامان دیکھ کر اور اپنے نیچے نہایت نرم اور قیمتی بستر پا کر معاً" ان کے دل میں خیال آیا کہ جس رسول پاکؐ کی جوتیوں کے صدقے میں آج ہم کو یہ مرتبے نصیب ہوئے ہیں ۔ اس نے بوریے پر سو سو کر زندگی گزاری تھی ۔ یہ خیال آنا تھا کہ آنسوؤں کی جھڑی بندھ گئی ۔ اس بستر پر لیٹنا ان کے لیے ناممکن ہو گیا ۔ اٹھے اور برابر کے غسل خانہ میں جا کر ایک کرسی پر بیٹھ گئے ۔ اور مسلسل رونا شروع کر دیا ۔ جب دل کو قرار آیا تو اپنے ملازم کو بلا کر اپنا بستر کھلوایا اور ایک چار پائی اس غسل خانے میں بچھوائی اور جب تک وہاں مقیم رہے غسل خانہ ہی میں سوتے رہے۔ یہ وفات سے کئی برس پہلے کا واقعہ ہے ۔ جب باہر کی دنیا ان کو سوٹ بوٹ میں دیکھا کرتی تھی ۔ کسی کو خبر نہ تھی کہ اس سوٹ کے اندر جو شخص چھپا ہوا ہے ۔ اس کی اصلی شخصیت کیا ہے ؟ وہ ان لوگوں میں سے نہ تھا۔ کہ جو سیاسی اغراض کے لیے سادگی و فقر کا اشتہار دیتے ہیں ' اور سوشلسٹ بن کر غریبوں کی ہمدردی کا دم بھرتے ہیں ' مگر پبلک کی نگاہوں سے ہٹ کر ان کی تمام زندگی رئیسانہ اور عیش پسندانہ ہے۔

(۲)

۱۹۲۴ء سے ۱۹۳۸ء تک کا زمانہ ہندوستان کے مسلمانوں کی تاریخ کا نازک ترین زمانہ تھا ۔ اس وقت مسلمانوں نے تحریکِ خلافت میں اپنی تمام تر پونجی لگا دی تھی۔ ان کو یہ احساس تھا کہ خلافت اسلامیہ کو بچانے کے لیے اور مسلمانوں کے مقامات مقدسہ کو اغیار کے قبضہ سے چھڑانے کے لیے جو کچھ ہم سے ہو سکتا ہے وہ ہمیں کر گزرنا چاہیے ۔ اس غرض کے لیے انہوں نے نہ اپنا مال خرچ کرنے میں کوئی کسر اٹھا رکھی اور نہ اپنی جانیں قربان کرنے میں کوئی دریغ کیا ۔ وہ اس مقصد کے لیے اس حد تک گئے کہ جن ہندوؤں کے متعلق ان کو صدیوں سے تجربہ تھا کہ وہ اسلام اور مسلمانوں کے بارے میں کیا جذبات رکھتے ہیں انہوں نے ان کے ساتھ بھی محض اس امید پر اتحاد و تعاون کرنے میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی کہ کسی طرح سے ہم خلافت کے ادارے کو بچا لے جائیں اور اپنے مقامات مقدسہ کو اغیار کے قبضہ سے چھڑا لیں۔ لیکن آخر کار اس ساری تگ و دو کا جو انجام ہوا وہ یہ تھا کہ جس خلافت کو بچانے کے لیے انہوں نے سر دھڑ کی بازی لگائی تھی اس کی بساط انہی لوگوں نے لپیٹ دی جن کی خلافت کے لیے مسلمان کوشش کر رہے تھے اور جن مقاماتِ مقدسہ کی حفاظت کے لیے وہ اپنی جان لڑا رہے تھے انہی مقاماتِ مقدسہ کے

رہنے والے قومیت کے بت کے پرستار بن گئے اور انہوں نے آپس میں کشت و خون شروع کر دیا۔ آپس میں عداوتوں اور لڑائیوں پر اتر آئے اور وہ خود ہی مقامات مقدسہ پر اغیار کے مستقل قبضے اور تسلط کا ذریعہ بن گئے ۔ ایک طرف تو ہندی مسلمانوں کو خلافت کے تحفظ کے سلسلے میں اپنی ساری کوششوں کا یہ نتیجہ دیکھنا نصیب ہوا اور دوسری طرف جس کانگریس کے ساتھ انہوں نے اتحاد اور جن ہندوؤں کے ساتھ انہوں نے تعاون کیا تھا وہی ان پر ٹوٹ پڑے اور ۱۹۲۴ء سے ہندو مسلم فسادات کا سلسلہ شروع ہو گیا ۔ اس سارے عرصے میں کانگریس کے لیڈروں کو ان لوگوں کی مذمت کرنے کی کبھی ہمت نہ ہوئی جو مسلمانوں کے ساتھ یہ مظالم کر رہے تھے ــــــ گویا مسلمانوں کو اس موقع پر دوہری شکست سے دوچار ہونا پڑا۔ ایک طرف جس مقصد کے لیے جان لڑائی تھی وہ مقصد فوت ہوگیا اور دوسری طرف جن لوگوں سے اتحاد کیا تھا وہ مسلمانوں سے لڑنے اور ان کو تباہ کرنے کے درپے ہو گئے ۔ سب سے زیادہ انہوں نے گاندھی جی پر اعتماد کیا تھا اور انھیں اپنا لیڈر بنایا تھا مگر خود انہی کو کبھی اس بات کی توفیق نہ ہوئی کہ وہ اس مرحلے پر مسلمانوں پر ہندوؤں کی زیادتیوں کے خلاف زبان کھولتے۔ اس صورت حال کا نتیجہ یہ ہوا کہ مسلمانوں پر یکایک ایک سخت مایوسی طاری ہو گئی اور ان کی ہمتیں ٹوٹ گئیں ۔ میں اس زمانے میں ہونے والے ان سارے حالات کا شاہد ہوں اور بکثرت ایسے لوگ بھی موجود ہیں جن کے سامنے یہ ساری تاریخ گزری ہے کہ کس طرح مسلمان ایک شدید مایوسی کا شکار ہو کر رہ گئے ۔ اس کے ساتھ اس ساری لیڈر شپ سے مسلمانوں کا اعتماد اٹھ گیا جنھوں نے تحریک خلافت اٹھائی تھی اور اس میں کانگریس کے ساتھ اتحاد کیا تھا ۔ اس طرح مسلمان مایوس بھی ہو گئے اور بے قیادت بھی رہ گئے ۔ پوری قوم میں ایک ہمہ گیر اور شدید انتشار کی کیفیت رونما ہو گئی۔ اس انتشار کی حالت میں مسلمان اپنی آنکھوں سے یہ دیکھ رہے تھے کہ غیر مسلم ایک لیڈر کی لیڈر شپ میں پوری طرح سے متحد ہیں اور ہندوستان پر اپنے قبضے کو مکمل کرنے کے لیے ہر ممکن جدو جہد میں مصروف ہیں اور دوسری طرف مسلمان بالکل اس قابل نہیں تھے کہ اس صورت حال کا مقابلہ کر سکیں اور اپنے تحفظ کی کوئی تدبیر اختیار کر سکیں۔

ایک طرف تو یہ مصیبت تھی اور دوسری طرف عین اسی زمانے میں یہ فتنہ رونما ہوا کہ مسلمانوں کے اندر الحاد و دہریت کی تحریکیں اٹھنی شروع ہوئیں اور اسلام کی حقانیت پر کھلم کھلا حملے کیے جانے لگے ۔ مسلمانوں کی پوری تاریخ میں کبھی اس طرح علانیہ الحاد و دہریت کی دعوت نہیں اٹھی تھی جس طرح کی اس زمانے میں اٹھی ۔ مسلمانوں کے تعلیمی اداروں میں کیمونزم کی

اشاعت شروع ہو گئی ــــــــــــ پورے پورے رسائل و جرائد اس غرض کے لیے نکلنے شروع ہو گئے کہ مسلمانوں میں الحاد و دہریت کی تبلیغ کریں۔ اخلاق بے قیدی کی تعلیم مسلمانوں کو دی جانے لگی اور کھلم کھلا دی جانے لگی۔ رفتہ رفتہ حالت یہ ہو گئی کہ لوگوں کو یہ بات عجیب معلوم ہوتی تھی کہ کوئی شخص پڑھا لکھا بھی ہو اور وہ خدا کو بھی مانتا ہو اور نماز روزہ جیسے احکام کی پیروی بھی کرتا ہو۔ اندازِ نظر اس حد تک بدلا کہ لوگ یہ سمجھنے لگے کہ جو شخص نماز پڑھ رہا ہے اس کو اپنی حرکت پر شرمانا چاہیے، جو نہیں پڑھ رہا ہے اس کو شرمانے کی ضرورت نہیں ــــــــــــ ایک طرف تو مسلمانوں کے سیاسی اور تہذیبی و نظریاتی اختلال کا یہ عالم تھا اور اس کے ساتھ جس مصیبت میں وہ گرفتار تھے وہ یہ تھی کہ ان کی کوئی قابل اعتماد قیادت اس وقت موجود نہیں تھی۔ جن لوگوں نے جنگِ عظیم اول سے پہلے اور جنگ کے زمانے میں، جس حد تک بھی ہو سکا تھا اسلام کے علم کو بلند رکھا تھا وہ یا تو خاموش ہو چکے تھے، یا مسلمانوں کے اندر ان کے اثر و نفوذ کو نقصان پہنچ چکا تھا، یا انہوں نے اسلام کی دعوت کا راستہ چھوڑ کر قومیت اور وطنیت کی دعوت کا راستہ اختیار کر لیا تھا ــــــــــــ اس عالم میں صرف اقبال وہ شخص تھا جس نے اس پوری صورت حال کا مقابلہ کیا اور واقعہ یہ ہے کہ ۱۹۲۴ء سے ۱۹۳۸ء تک چودہ سال کی مدت میں اسلامی تحریک اور اسلامی جذبے کے احیاء کے لیے اور مسلمانوں میں اسلامی اور ملی شعور کو ابھارنے اور بیدار رکھنے کے لیے اگر کوئی سب سے بڑی طاقت کام کر رہی تھی تو وہ اکیلے اقبالؒ کی طاقت تھی۔ جو لوگ بھی کلام اقبال پر نگاہ رکھتے ہیں اور انہوں نے ان کی نظم و نثر پڑھی ہے وہ اس بات کی گواہی دیں گے کہ اقبال نے ہندی مسلمانوں کے گرتے ہوئے وقار کو بچانے اور انہیں اپنے مٹتے ہوئے ملی تشخص کو بچانے کے لیے کس طرح آمادۂ کار کیا اور اس غرض کے لیے انہوں نے نظم و نثر دونوں کی قوت سے کام لیا۔

اقبال کے کارنامے کو ہم مختلف عنوانات کے تحت بیان کر سکتے ہیں۔

مغربی تہذیب پر ضرب کاری

سب سے اہم کام جو اقبال نے انجام دیا وہ یہ تھا کہ انہوں نے مغربیت اور مغربی مادہ پرستی پر پوری قوت کے ساتھ ضرب لگائی۔ اگرچہ یہ کام اس وقت علمائے دین اور اہلِ مدارس اور خطیب حضرات بھی انجام دے رہے تھے مگر ان کی باتوں کو یہ کہہ کہ نظر انداز کر دیا جاتا تھا اور کیا جا سکتا تھا کہ یہ لوگ مغربی فلسفہ اور مغربی تہذیب و تمدن سے واقفیت نہیں رکھتے تھے

------------ ان کے برعکس اقبالؒ وہ شخص تھا کہ وہ ان سے زیادہ مغرب کو جانتا تھا۔ اور ان سے زیادہ مغرب کے فلسفے اور مغربی علوم سے واقف تھا اس لیے جب اقبال نے مغربیت، مغربی مادہ پرستی، مغربی فلسفے اور مغربی افکار پر چوٹ لگائی تو مسلمانوں پر مغرب کی جو مرعوبیت طاری تھی وہ کافور ہونے لگی اور واقعہ یہ ہے کہ اس مرعوبیت کو توڑنے میں اکیلے اقبال کا کارنامہ سب سے بڑھ کر ہے۔

اگرچہ علامہ اقبال نے مسلمانوں کی جسمانی غلامی توڑنے کے لیے بھی کوشش کی اور ان کو آزادی کا سبق دیا لیکن حقیقت یہ ہے کہ کسی قوم کا ذہن اگر غلام ہو تو خواہ اس کا جسم آزاد بھی ہو جائے تب بھی وہ قوم آزاد نہیں رہ سکتی۔ اس وجہ سے اقبال نے مسلمانوں کی اس ذہنی غلامی کو بھی ختم کرنے کی کوشش کی جو ان پر طاری ہو گئی تھی ------------ اقبال کا خودی کا فلسفہ، جس کے متعلق لوگ سمجھتے ہیں کہ یہ کوئی چیستان یا معمہ ہے، یہ درحقیقت اس بات کے لیے تھا کہ مسلمان اپنے آپ کو پہچانیں کہ وہ کیا ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ مسلمان اپنے آپ کو بھول گئے تھے ان کو اپنی تاریخ سے شرم آتی تھی، وہ اپنی روایات، اپنی تہذیب، اپنے عقیدے اور اپنی اخلاقی اقدار کے بارے میں شدید احساس کمتری کا شکار ہو چکے تھے۔ وہ سمجھتے تھے کہ اگر دنیا کی تاریخ میں کوئی قابل قدر چیز ہے تو وہ صرف اہل مغرب کی پیش کی ہوئی ہے۔ یہ صورت حال اس وجہ سے پیدا ہوئی کہ مسلمانوں کی نئی نسلوں کو کچھ پتہ نہیں تھا کہ ان کا اپنا سرمایہ کیا ہے۔ اس موقع پر اقبال مرحوم نے مسلمانوں کے اندر یہ احساس پیدا کیا کہ تمؓ دنیا بھر میں سب سے زیادہ قابل فخر تہذیب رکھتے ہو۔ تمہارے پاس دنیا کا بہترین نظامِ حیات ہے اور تم سب سے زیادہ صحیح اور اعلیٰ اخلاقی اقدار رکھتے ہو۔ اپنی خودی کو پہچانو اور اپنے آپ کو جانو کہ تم کیا ہو۔ تم نے اپنے کو کھو دیا ہے۔ اور اپنی حقیقت کو گم کر دیا ہے۔ اپنے قومی تشخص کو سمجھو اور اپنی تہذیبی سربلندی کے لیے سرگرم عمل ہو جاؤ۔

اس کے ساتھ اقبال نے مسلمانوں کے اندر یہ احساس پیدا کیا کہ اسلام کوئی پرانا اور از کارِ رفتہ نظام نہیں ہے جو اس زمانے میں کام نہ کر سکتا ہو۔ انہوں نے اپنے شعر سے بھی اور اپنی نثر سے بھی یہ بات مسلمانوں کے ذہن نشین کی کہ اسلام ازلی اور ابدی اصولوں کا حامل ہے۔ اسلام کسی وقت بھی پرانا نہیں ہو سکتا۔ اس کے اصول ہر زمانے میں یکساں قابل عمل ہیں۔ اگرچہ اسلام کی حقانیت کی شہادت اس وقت علمائے دین منبروں پر بھی دے رہے تھے اور مدرسوں میں بھی، لیکن جب اس مغربی تہذیب کی آغوش میں پرورش پائے ہوئے اور مغربی فلسفے پر عبور

رکھنے والے آدمی نے اٹھ کر اسلام کی حقانیت کی شہادت دی تو مسلمانوں کے قلوب و اذہان پر اس کا نہایت گہرا اور پائیدار اثر پڑا۔ اس وقت مختلف فتنوں کی یلغار کے درمیان مسلمانوں کی جو نسل گمراہ ہو رہی تھی اس کو بچانے کے لیے اہلِ منبر وہ کام نہیں کر سکتے تھے جو مغربی تعلیم یافتہ اور مغربی علوم میں مہارت کاملہ رکھنے والا یہ آدمی انجام دے سکتا تھا اور واقعہ یہ ہے کہ جب اس نے ایک باوقار، پر اعتماد اور مجتہدانہ شان کے ساتھ اسلام کی حقانیت کی شہادت دی تو نئی نسل کے اندر ایک نیا اسلامی شعور پیدا ہوا۔

وطنی قومیت کی تردید

اس کے ساتھ علامہ اقبال نے جو عظیم کارنامہ انجام دیا وہ یہ ہے کہ انھوں نے وطنی قومیت اور قوم پرستی پر ایک شدید ضرب لگائی ۔ حقیقت یہ ہے کہ اگر انھوں نے قوم پرستی نیشنلزم اور وطنی قومیت پر بروقت ضرب کاری نہ لگائی ہوتی تو آگے چل کر مسلمانوں کو کانگرس میں جذب کرنے کے لیے جو تحریک اٹھی تھی اس سے مسلمانوں کا بچ جانا محال تھا ــــــــ ایسے حالات میں کہ جب علماے دین تک اٹھ کر مسلمانوں کو وطنی قومیت کا درس دینے لگے تھے اور مسلمانوں کے بڑے بڑے متقی علما تک مسلمانوں سے یہ کہنے لگے تھے کہ وطنی قومیت سے تمھارے دین کو کوئی خطرہ نہیں ۔ اس موقع پر یہ صرف اقبال تھا جس نے پوری شدت کے ساتھ اس تباہ کن تصور کا تار و پود بکھیرا، اور لوگوں کو پوری قوت کے ساتھ یہ بتایا کہ وطن بھی ایک بت ہے اور وطن کی پرستش کرنا بھی ویسا ہی شرک ہے جیسا کہ کسی بت کی پرستش کرنا شرک ہے۔ اگر اقبال نے یہ تعلیم بروقت نہ دی ہوتی تو بعد میں کانگرس نے رابطہ عوام (Mass Contact) کی جو تحریک شروع کی تھی اور جس میں علماء اور اشتراکی حضرات بھی شریک تھے، وہ تحریک مسلمانوں کو ہندوؤں کے اندر اس طرح گھلا دیتی جیسے کہ نمک پانی کے اندر گھل جاتا ہے ۔ لیکن اقبال نے مسلمانوں میں یہ احساس پیدا کیا کہ قومیت، وطن اور زبان سے نہیں بنتی ہے بلکہ قومیت دین اور عقیدے سے بنتی ہے۔ اس نے مسلمانوں میں اس شعور کو بیدار کیا کہ تم ایک عقیدہ اور ایک تہذیب رکھنے والی قوم ہو، تمھاری قومیت ان لوگوں سے بالکل مختلف ہے جن کی تہذیب اور عقیدہ و مسلک تم سے الگ ہے۔

وحدتِ ملّی کا احساس

اس کے ساتھ اقبال نے مسلمانوں کے اندر یہ احساس بھی ابھارا کہ تمام دنیا میں ملّتِ

اسلامیہ ایک وحدت ہے اور اس کو ایک وحدت ہونا چاہیے ——— اس طرح انہوں نے بیک وقت دو کام کیے ——— باہر کی دنیا میں مسلمان جس طرح قوم پرستی میں مبتلا ہو کر ایک دوسرے سے کٹ رہے تھے اور ایک دوسرے کو کاٹ رہے تھے۔ اور جس طرح ترکوں اور عربوں کے درمیان ایک المناک کشمکش برپا ہوئی اور اس کے نتیجے میں شرق اوسط پر جو تباہی آئی اور تمام ممالک اسلامیہ جس مصیبت میں مبتلا ہوئے وہ سب اس قوم پرستی کا نتیجہ تھا۔ جس کی تبلیغ و اشاعت عیسائیوں نے عربوں اور ترکوں کے درمیان کی تھی ——— ایک طرف تو اقبال نے تمام دنیا کے مسلمانوں کو اس بات کی دعوت دی کہ تم ایک ملّتِ واحدہ ہو اور جس قوم پرستی میں تم مبتلا ہو یہ ایک بالکل غلط اور مہلک تصور ہے اور دوسری طرف انہوں نے ہندی مسلمانوں میں یہ احساس پیدا کیا کہ تم مسلمان ہونے کی حیثیت سے ایک قوم اور ایک ملّت ہو۔ تمہارا کسی دوسری قوم میں جذب ہونا سراسر ایک باطل نظریہ ہے ——— اگر اقبال نے بروقت یہ اقدام نہ کیا ہوتا اور اسلامی قومیت کے صحیح تصور کی تبلیغ کر کے مسلمانوں کے اندر اپنی اسلامی قومیت کا احساس پیدا نہ کر دیا ہوتا تو آج پاکستان کا کہیں وجود نہ ہوتا۔

آج اگر ہندوستان میں مسلمان ایک قوم کی حیثیت سے اپنے تہذیبی وجود پر اصرار کر رہے ہیں تو وہ بھی اسی تعلیم کی وجہ سے کر رہے ہیں جو اقبال نے اس وقت دی تھی، اور یہ پاکستان بھی اسی تعلیم کی وجہ سے معرضِ وجود میں آیا جس نے مسلمانوں میں اس احساس کو بیدار کر دیا کہ وہ ایک قوم اور ایک ملت ہیں۔

دین و سیاست کے متعلق باطل تصور کی بیخ کنی

اقبال نے ایک بڑا کارنامہ یہ بھی انجام دیا کہ دین اور سیاست کی علیحدگی اور دنیا و دین کی تفریق کا جو تصور مغرب سے آکر مسلمانوں میں پھیل رہا تھا اور جس کی وجہ سے لوگ یہ سمجھنے لگے تھے کہ اہلِ دین کو سیاست سے کیا تعلق اور دین کو سیاست میں گھسیٹنے کا کیا کام، اقبال نے اس باطل تصور کا ٹھیک وقت پر مقابلہ کیا۔ اس نے دینِ بے سیاست کی بھی برملا مذمت کی اور سیاستِ بے دین کو بھی علانیہ مذموم قرار دیا۔ سیاستِ بے دین کے متعلق اقبال کا ایک مصرع ایسا ہے کہ اس موضوع پر تمام دنیا کا لٹریچر ایک طرف اور وہ مصرع ایک طرف ——— ان کا کہنا ہے کہ:

جدا ہو دیں سیاست سے تو رہ جاتی ہے چنگیزی

اگر آپ اس موضوع پر دنیا بھر کی کتابیں پڑھ ڈالیں تو آپ دیکھیں گے کہ اس مصرع میں

ان سب کا خلاصہ اور عطر نکال کر رکھ دیا گیا ہے ۔ اقبال نے ان الفاظ سے در اصل یہ بات ذہن نشین کی ہے کہ جب تم سیاست کو دین سے الگ کرتے ہو تو اس کا نتیجہ سوائے وحشت و بربریت اور ظلم و ستم کے اور کچھ نہیں ہو سکتا ۔ سیاست صرف اسی صورت میں ٹھیک رہ سکتی ہے جب کہ دین اس کو صحیح راستے پر قائم رکھنے کے لیے ایک رہنما قوت کی حیثیت سے اس کے ساتھ موجود ہو۔

اسی طرح سے مسلمانوں کے دماغوں میں جو یہ خیال جاگزیں ہو چکا تھا کہ اہل دین کا کام تو بس اللہ اللہ کرنا ہے یا مسجدوں اور مدرسوں میں فقط قرآن وحدیث پڑھنا ہے ' ان کا سیاست سے بھلا کیا تعلق ---------- اس غلط تصور پر بھی اقبال نے ایک کاری ضرب لگائی ہے اور اس کو بھی ایک مصرع میں بیان کر دیا اور واقعہ یہ ہے کہ اس موضوع پر جتنا کچھ لکھا جا سکتا ہے وہ سب ایک طرف اور وہ مصرع ایک طرف -------- اقبال کہتا ہے کہ ۔

عصا نہ ہو تو کلیمی ہے کارِ بے بنیاد

اس ایک مصرع میں یہ سب حقیقت کھول دی گئی ہے کہ اگر دین کے پاس اپنے عقیدے اور نظام کو نافذ کرنے کے لیے طاقت نہیں ہے تو طاقت جس شخص یا گروہ یا نظام کے پاس ہے وہ دنیا کو اپنے راستے پر ہانک کر لے جائے گا ' آپ کے لیے کلیمی کرنے کا کیا موقع باقی رہے گا ' اور وہ کلیمی کہاں بروئے عمل آئے گی۔

اقبالؒ نے پورے زور کے ساتھ یہ بات لوگوں کے ذہن نشین کی کہ موجودہ زمانے کے ازم انسانیت کے دکھوں کا مداوا نہیں ہیں بلکہ واقعہ یہ ہے کہ اس زمانے میں جتنا ظلم و ستم ' فساد و غارت گری اور انسانیت کے لیے آلام و مصائب رونما ہوئے ہیں وہ سب انہی ازموں کا کیا دھرا ہے ۔ یہی وجہ ہے کہ اقبال نے جس طرح ان ازموں میں سے سرمایہ داری کی مذمت کی ہے اسی طرح سے اس نے اشتراکیت کی بھی مذمت کی ہے ۔ ان کا آخری پیغام جو انھوں نے اپنی وفات سے دو ڈھائی مہینے پہلے آل انڈیا ریڈیو سے دیا تھا اور غالباً" ان کو یہ پتہ بھی نہیں تھا کہ وہ یہ آخری پیغام دنیا کو دے رہے ہیں۔ اس میں انھوں نے بالکل وضاحت کے ساتھ یہ بتایا ہے کہ وہ اس وقت انسانیت جن مصائب میں گرفتار ہے اور جس ہلاکت و تباہی کی طرف بڑھ رہی ہے وہ سب ان ازموں کی وجہ سے ہے ۔ ان کے اس پیغام پر مشکل سے دو سال گزرے تھے کہ وہ تباہی جنگِ دوم کی صورت میں دنیا پر مسلط ہوئی اور اس کے بعد بھی اس کا خطرہ مستقل طور پر موجود ہے ۔ انھوں نے وضاحت کے ساتھ یہ بتایا تھا کہ انسانوں کے یہ خود تراشیدہ ماڈرن ازم ہی

در اصل انسان کے مصائب کا سرچشمہ ہیں اور انہی ازموں نے اس وقت انسانیت کو معیشت عظمیٰ میں مبتلا کیا ہے اور اس کے لیے تباہی اور ہلاکت کی راہیں ہموار کی ہیں۔ انہوں نے اپنے اس پیغام میں اشتراکیت، سرمایہ داری، ملوکیت، آمریت، نازیت، مطلقیت سبھی کی مذمت بھی کی ہے اور انہیں انسانیت کے لیے مہلک قرار دیا ہے۔

اس کے ساتھ اقبالؒ نے مثبت طور پر یہ بات مسلمانوں کے ذہن نشین کی ہے کہ تمہاری مصیبتوں اور مسائل کا اگر کوئی حل ہے تو وہ صرف یہ ہے کہ تم قرآن کی پیروی کرو، اور اپنی زندگیوں پر اسلام کے آئین کو نافذ کرو۔ انہوں نے ۱۹۳۷ء میں قائد اعظمؒ کے نام جو خط لکھا تھا اس میں واضح طور پر یہ بتایا تھا کہ مسلمانوں کے معاشی مسائل کا اگر کوئی حل ہے تو وہ صرف اسلامی آئین کے نفاذ میں مضمر ہے۔

یہ وہ کارنامہ تھا جو اقبال نے اپنی زندگی میں انجام دیا۔

(ماخوذ (۱) رسالہ "جوہر" دہلی، اقبال نمبر ۱۹۳۸ء - (۲) ہفت روزہ "آئین" لاہور)

بقیہ: رسائل و مسائل

ایسی صورت میں عہد اطاعت کی عمداً خلاف ورزی کرنا، بہرحال ایسا گناہ اور کمزوری ضرور ہے کہ اس سے استغفار بھی کیا جائے اور صدقہ بھی دیا جائے۔ اور دوسری نیکیاں بھی کی جائیں کہ "اِنَّ الْحَسَنٰتِ یُذْھِبْنَ السَّیِّاٰتِ" "نیکیاں برائیوں کو ختم کر دیتی ہیں" کا قرآنی اصول اس کی رہنمائی کرتا ہے۔ لیکن اس گناہ کے بارہ میں متعین طور پر نص وارد نہیں ہے کہ بطور کفارہ صدقہ دیا جائے۔ اسی لیے امیر جب مناسب سمجھے کہ عہد کی خلاف ورزی کرنے والے کو صدقہ یا کسی اور نیکی کا حکم دینا چاہیے تو وہ ایسا کر سکتا ہے لیکن اسے نظام کفارہ کا نام دینے کے بجائے "نظام صدقات و حسنات" کا نام دینا زیادہ بہتر ہے۔ مقصد بھی حاصل ہو جائے گا اور تعبیر پر کوئی اشکال بھی نہیں ہو گا۔ واللہ اعلم۔

رسائل و مسائل

کیا عہدِ رکنیت کی خلاف ورزی پر کفارہ کا حکم جائز ہے ؟

تحریکِ اسلامی ...... نے مقامی طور پر اس سال بھی اپنا سالانہ منصوبہ بنایا ہے ۔ اس منصوبہ میں اس دفعہ یہ اضافہ بھی کیا ہے کہ کفارہ کا نظام قائم کیا ہے ۔ تفصیل یوں ہے کہ ہم نے یہ طے کیا ہے کہ ہر رکن کا فرض ہو گا کہ وہ اپنی زندگی دعوت دین اسلام کے مطابق ڈھالنے ' نظم و ضبط اور سمع و اطاعت کی پابندی کرتے ہوئے گزارے گا۔ رکنیت کے وقت وہ اس کا اقرار بھی کرتا ہے کہ اس نے یہ اصول پڑھ لیے ہیں اور وہ ان کا پابند رہے گا ۔ اب نئے منصوبہ میں اس پس منظر کے تحت یہ بات بھی شامل کی گئی ہے کہ اگر کوئی رکن نظم و ضبط وغیرہ کی پابندی نہیں کرتا ' جیسے اجتماعات میں دیر سے آنا ' نہ آنا یا بدگوئی اور ناظم سے جھگڑنے وغیرہ کا عمل کرتا ہے تو اس پر کفارہ عائد کیا جائے گا ۔ اس لفظ پر چند حضرات کو اعتراض ہے : مثلاً ' یہ دینی اصطلاح ہے اور صرف انہی مخصوص معنوں میں استعمال ہوتی ہے جو قرآن میں بیان کیے گئے ہیں ' اس کو کسی اور جگہ استعمال نہیں کیا جا سکتا ۔ اسی طرح ' یہ بھی کہ کفارہ کا لفظ استعمال کرنے سے اعمال کو حرام و حلال کرنے کا کام تحریک اسلامی نے اپنے ذمہ لے لیا ہے ' جب کہ یہ صرف اللہ کا حق ہے ' وغیرہ وغیرہ۔

اب سوال یہ ہے کہ کیا درج بالا صورت میں دی گئی شکلوں میں کفارہ کا لفظ استعمال کیا جا سکتا ہے یا نہیں ۔ اور اگر نہیں کیا جا سکتا تو مناسب لفظ کیا ہو گا ۔ اگر استعمال کیا جا سکتا ہے تو کفارہ کی کیا شکلیں ہو سکتی ہیں۔

جواب : جب ایک شخص اطاعت نظم کا عہد کرتا ہے تو وہ شرعاً اپنے عہد کو پورا کرنے کا پابند ہو جاتا ہے ۔ یہ ایک شرعی ضابطہ ہے ۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے ۔ یَا اَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اَوْفُوْا بِالْعُقُوْدِ (المائدہ) اے ایمان لانے والو ! عقدوں کو پورا کرو (یعنی وعدوں کو)۔ حدیث شریف میں

آتا ہے: لا ایمان لمن لا امانۃ لہ ولا دین لمن لا عھد لہ (مشکوۃ شریف) "جس میں امانت نہیں اس میں ایمان نہیں، اور جو عہد کا پاس نہیں کرتا اس کا کوئی دین نہیں۔ "ظاہر بات ہے کہ "دین" کو ایک انسان عہد کے ذریعہ ہی اختیار کرتا ہے۔ وہ اپنے دل اور زبان سے دین میں داخل ہونے اور اس کا پابند رہنے کا فیصلہ کرتا ہے۔ پس اگر ایک انسان "عہد" پر قائم نہیں رہ سکتا تو اس کے بارے میں کیسے اطمینان کیا جا سکتا ہے کہ اس نے جس دین کو اختیار کیا ہے اس پر قائم رہے گا۔ اس کے برعکس اس سے ہر وقت خطرہ رہے گا کہ وہ جس دین میں داخل ہوا ہے اسے چھوڑ کر کسی دوسرے دین میں داخل ہو جائے گا۔ ایک آدمی کا وزن اس کے قول و قرار سے پیدا ہوتا ہے۔ اس بناء پر شریعت میں عہد کی بڑی اہمیت ہے۔ اہل ایمان کی مستقل صفت کے طور پر اسے ذکر کیا گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَالْمُوفُونَ بِعَهْدِهِمْ إِذَا عَاهَدُوا (البقرہ) "وہ جب عہد کرتے ہیں تو اسے پورا کرتے ہیں"۔ ایمان باللہ، اقامت صلوۃ، ایتاء الزکوۃ کے بعد اس صفت کا ذکر کیا گیا ہے۔ قرآن پاک میں اسلوب بدل بدل کر اس کا ذکر کیا گیا ہے۔ یہ تو ہر عہد کا حکم ہے۔ چاہے ایسا عہد ہو جس کے کرنے نہ کرنے کا ایک انسان کو اختیار ہو مثلاً زید کو اختیار ہے کہ وہ عمرو کے ساتھ سودا کرے، اور یہ بھی اختیار ہے کہ نہ کرے، لیکن جب اس نے عمرو سے عہد کر لیا کہ وہ فلاں چیز کو اتنے روپیہ میں خریدے گا، وہ کسی اور کو فروخت نہ کرے، تو اگرچہ ابھی سودا ہوا نہیں لیکن اخلاقاً" زید پابند ہے کہ وہ اپنا عہد پورا کرے اور اس سے سودا خریدے۔ لیکن ایک ایسا عہد جس کو پورا کرنا اللہ کے ساتھ کئے ہوئے عہد کو پورا کرنا قرار پاتا ہو تو اس عہد کی خلاف ورزی پر گناہ ہو گا۔

اللہ تعالیٰ کے دین کو قائم کرنا، نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد، ہر مسلمان پر فرض ہے اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے جتنے فرائض ہم پر عائد ہیں، ہم نے ایمان لا کر انہیں پورا کرنے کا عہد کیا ہے۔ ایمان در اصل اللہ تعالیٰ کے ساتھ اس بات کا معاہدہ ہے کہ میں اللہ تعالیٰ کی حکومت کو مانتا ہوں اور اس کے مقابلہ میں تمام حکومتوں کا انکار کرتا ہوں "لَا إِلٰهَ إِلَّا اللهُ مُحَمَّدٌ رَّسُولُ اللهِ" کا یہی مطلب ہے۔ الٰہ، معبود اور حاکم کو کہتے ہیں، اور رسول نمائندے کو کہتے ہیں۔ اس لیے کلمہ طیبہ کا معنی یہ ہے کہ میں اللہ تعالیٰ کے سوا کسی کی حاکمیت کو نہیں مانتا بلکہ صرف اس حکومت الٰہیہ کو مانتا ہوں جسے اللہ تعالیٰ نے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعے زمین میں قائم کیا ہے۔ یہ نظام نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے کتاب و سنت کی شکل میں ہمیں دیا، اسے عملاً نافذ فرمایا، انسانوں کو اس نظام پر ایمان لانے کی دعوت دی، اس کے لیے جہاد و قتال کیا اور فرمایا

الجہاد ماض الی یوم القیمۃ" "جہاد قیامت تک جاری رہے گا۔" اس نظام کی خاطر جان دینا شہادت ہے۔ "من قاتل لتکون کلمۃ اللہ ھی العلیا فھو فی سبیل اللہ" "جس نے اس لیے قتال کیا کہ اللہ کا نظام بالا تر ہو تو وہ لڑائی فی سبیل اللہ ہے۔" گویا کہ یہ نظام ہماری جانوں سے بھی زیادہ عزیز ہے۔ اس نظام پر جان و مال، بیوی عزیز و اقارب، کاروبار وغیرہ سب چیزیں قربان کی جائیں گی۔ یہ اولین فرض ہے باقی فرائض اس کے بعد ہیں۔

لیکن اس وقت یہ نظام معطل ہے اور وہ نظام جماعت بھی باقی نہیں جسے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے قائم فرمایا تھا، جس نظام جماعت کی بدولت تمام مسلمان ایک امت ہوتے ہیں، اس نظام کے معطل ہو جانے کے بعد ہم عملاً دوسرے نظاموں کے مطیع ہو کر رہ گئے ہیں، جو ہمارے ایمان کے منافی ہے، اس لیے ہر مومن کا فرض ہے کہ وہ مروجہ نظاموں کے مقابلہ میں اللہ کے نازل کردہ نظام کو قائم کرنے کے لیے اٹھ کھڑا ہو۔ لیکن افسوس ہے کہ تمام مسلمانوں کو اس کا شعور نہیں ہے۔ جن خوش قسمت اہل ایمان کو اس کا شعور ہے وہ اگر فرداً فرداً اس کام کو کریں تو ظاہر بات ہے کہ انفرادی کام نہ تو دیرپا ہوتا ہے نہ موثر، اس لیے ضروری ہوا کہ وہ منظم ہوں اور ایک جماعت کی شکل میں اس کام کو کریں۔ اس جماعت کو قائم کرنا قرآن پاک کی رو سے بھی ان پر فرض ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے وَلْتَكُنْ مِّنْكُمْ اُمَّةٌ يَّدْعُوْنَ اِلَى الْخَيْرِ وَيَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ" (آل عمران) ایسی جماعت میں شامل ہونا، جو خیر کی طرف دعوت دے، امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کرے، قرآن پاک کی رو سے کمالِ فلاح کا موجب ہے۔

پس اقامتِ دین کے فریضہ کے ادا کرنے کے لیے جماعت بنانا، اس جماعت میں شامل ہونا عقلاً بھی ثابت ہے اور قرآن و سنت کی نصوص بھی اس پر دلالت کرتی ہیں۔ ایسی صورت میں اقامتِ دین کی جدوجہد میں حصہ لے کر ایک انسان اس عہد کو بھی پورا کرتا ہے، جو اس نے اللہ تعالیٰ کے ساتھ کیا ہے اور اس عہد کو بھی پورا کرتا ہے جو اس نے جماعت کے ساتھ اس میں شامل ہوتے وقت کیا ہوتا ہے۔ لیکن یہ عجیب و غریب صورت حال ہے کہ ایک انسان جماعت میں شامل ہو لیکن نظم کی اطاعت نہ کرے۔ اس کی مثال تو ایسی ہے کہ ایک انسان فوج میں بھرتی بھی ہو لیکن اپنے کمانڈر کی اطاعت نہ کرے۔ ایسی صورت میں اسے سزا دی جاتی ہے معطل یا ڈسچارج کر دیا جاتا ہے، بعض اوقات جیل میں ڈال دیا جاتا ہے اور بعض صورتوں میں اسے پھانسی دے دی جاتی ہے، جرم کی نوعیت کے مطابق سزا دی جاتی ہے اور اسے کوئی بھی

شخص نامعقول نہیں قرار دیتا۔ قرآن پاک بھی ایسی ہی مطیع فرماں فوج تیار کرتا ہے۔ قرآن میں اہل ایمان کو تلقین کی گئی ہے يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا لَقِيْتُمُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا زَحْفًا فَلَا تُوَلُّوْهُمُ الْاَدْبَارَ ۝ وَمَنْ يُّوَلِّهِمْ يَوْمَئِذٍ دُبُرَهٗٓ اِلَّا مُتَحَرِّفًا لِّقِتَالٍ اَوْ مُتَحَيِّزًا اِلٰى فِئَةٍ فَقَدْ بَآءَ بِغَضَبٍ مِّنَ اللّٰهِ وَمَاْوٰىهُ جَهَنَّمُ ۭ وَبِئْسَ الْمَصِيْرُ (الانفال ۱۵ – ۱۶) ——— اے ایمان والو ' جب تم ایک لشکر کی صورت میں کفار سے دو چار ہو تو ان کے مقابلہ میں پیٹھ نہ پھیرو جس نے ایسے موقعہ پر پیٹھ پھیری ——— الا یہ کہ جنگی چال کے طور پر ایسا کرے یا کسی دوسری فوج سے جا ملنے کے لیے ——— تو وہ اللہ کے غضب میں گھر جائے گا ' اس کا ٹھکانا جہنم ہو گا ' اور وہ بہت بری جائے باز گشت ہے۔" احادیث میں میدان جنگ سے بھاگنے کو گناہ کبیرہ قرار دیا گیا ہے۔

یہ نہ شبہ کیا جائے کہ یہ تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے دور کے ساتھ خاص ہے اس لیے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے دور میں اس حکم کی وجہ اسلامی نظام کے لیے جان کی بازی لگانا تھا اور یہ سبب اس وقت سے قیامت تک کے لیے موجود ہے۔ اس نظام کو قائم کرنے یا قائم رکھنے کی خاطر جو چھوٹی بڑی جماعت قائم ہو گی اور جو بھی چھوٹا بڑا امیر ہو گا معروف میں اس کی اطاعت کرنا جماعت میں شامل ہونے کے بعد فرض ہو گا ——— اس کی اطاعت سے نکلنا ' جہاں اقامت دین کے مقصد کو نقصان پہنچانا ہے ' وہیں اپنے عہد کی خلاف ورزی بھی ہے جو ایک ایمانی اور اخلاقی کمزوری ہے۔ احادیث میں اس کی وضاحت کر دی گئی ہے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا (۱) السمع والطاعة على المرء والمسلم فيما احب و كره مالم يومر بمعصية فاذا امر بمعصية فلا سمع ولا طاعة (۲) من يطع الامير فقد اطاعني ومن عصى الامير فقد عصاني (۳) انما الامام جُنّةٌ يقاتل من ورائه ويتقى به فان امر بتقوى الله وعدل فان له بذالك اجرا وان قال بغيره فان عليه منه (۴) من رأى من اميره شيئا يكرهه فليصبر فانه ليس احدٌ يفارق الجماعة شبرًا فيموت الا مات ميتة الجاهلية۔

ان احادیث میں وضاحت سے کہہ دیا گیا ہے کہ اگر امیر معصیت کا حکم نہ دے تو اس کی اطاعت واجب ہے ' چاہے طبیعت کو پسند ہو یا ناپسند اور ایسی صورت میں حکم کی خلاف ورزی کرنا 'جماعت سے جدا راستہ اختیار کرنا جاہلیت کا طریقہ ہے۔

اس ساری تمہید کا مقصد در اصل یہ ہے کہ یہ بات سمجھا دی جائے کہ نظم کی خلاف ورزی کرنا گناہ ہے اور ایمان و اخلاق کے منافی ہے جس نے اس کی خلاف ورزی کی اس نے شریعت کی خلاف ورزی کی ' اپنے عہد کی خلاف ورزی کی اور جماعت سے الگ راہ اختیار کر کے

جاہلیت کا رویہ اپنایا۔

نظم کا کام ہے کہ لوگوں کو جماعت میں شامل کرتے وقت اچھی طرح پرکھ لے کہ وہ جماعت شمولیت کی حقیقت اور مقصد کو سمجھ گئے ہیں کہ نہیں اور بعد میں ان کی نگرانی کرے کہ وہ اپنے عہد اور اس کی حقیقت کو یاد رکھے ہوئے ہیں کہ نہیں۔ وقتاً فوقتاً انھیں اپنے عہد کے تقاضے دلائے اور کسی سے کوئی خلاف ورزی ہوتی ہو تو اسے مناسب انداز میں یاد دہانی کرائے یا تنبیہ کرے اور ضروری ہو تو اسے مناسب انداز میں یاد دہانی کرائے یا تنبیہ کرے اور ضروری ہو تو اسے توبہ استغفار اور صدقہ و خیرات کے ذریعہ اللہ تعالیٰ سے معافی مانگنے پر بھی متوجہ کرے۔ یہ کام ارکان اور جماعت کے مفاد میں ہوتا ہے اور اس پر ناراض ہونے کی بجائے خوش ہونا چاہیے۔ جس طرح مریض کو اس بات پر کہ طبیب اس کا معائنہ کرتا ہے 'دوا تجویز کرتا ہے' پرہیز کے لیے کہتا ہے' ناراض نہیں ہونا چاہیے اسی طرح ارکان کو بھی نظم کے ذمہ داران پر ناراض نہیں ہونا چاہیے کہ وہ بھی ان کی اصلاح کے لیے ایسا کرتے ہیں۔ در اصل اسی ناراضی کی وجہ اپنے جیسے امیر پر نظر کرنا اور اس کی اطاعت اور نافرمانی تک مسئلہ کو محدود کر دینا ہے۔ حالانکہ اصل محور نظام ہے۔ نظام کی حیثیت تو اپنی جگہ قائم ہے اور اسی نظام کی خاطر جماعت کا قیام اور اس میں شمولیت کا عہد ہے۔ امیر اسی نظام کی وقعت قائم رکھنے کی خاطر نظم کی خلاف ورزی کا نوٹس لیتا ہے۔ اور اسی کی خاطر وہ دوسری تنبیہات کی طرح مزید تنبیہ کرتے ہوئے "صدقہ" بھی عائد کرتا ہے کہ اس سے اس کے گناہ کا اثر زائل ہو جائے۔ حدیث شریف میں آتا ہے: الصدقۃ تطفیٔ الخطیئۃ کما یطفی الماء النار "صدقہ خطا کی حرارت کو اس طرح زائل کرتا ہے جس طرح پانی آگ بجھاتا ہے۔" صدقہ کی اس عمومی تاثیر کی بنا پر "صدقہ" کو کفارہ بھی کہا جا سکتا ہے۔ صحابہ کرامؓ میں یہ بات عام تھی۔ چنانچہ جب کعبؓ بن مالک کی توبہ قبول ہوئی تو انھوں نے عرض کیا ان من توبتی ان انخلع من مالی صدقۃ للہ (صحیح بخاری) یہ میری توبہ کا حصہ ہے کہ میں اپنا سارا مال اللہ کی راہ میں صدقہ کر کے اپنی ملک سے نکال دوں۔" اس پر نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "کچھ مال اپنے پاس رکھ لو" اس بناء پر اسے کفارہ کہا جا سکتا ہے۔ تاہم مناسب یہی ہے کہ آپ اسے کفارہ کا نظام کہنے کے بجائے صدقہ کا نام دے دیجیے۔ مذکورہ اصولوں کی بناء پر صدقہ کا نظام پہلے سے صلحاء میں رائج رہا ہے اور اسی لیے عامۃ المسلمین میں یہ معروف ہے کہ کسی سے جب کوئی چھوٹا بڑا گناہ ہو جاتا ہے تو وہ صدقہ کرتا ہے۔ مثلاً بعض علاقوں میں اب بھی رواج ہے کہ کسی سے قرآن پاک گر جائے تو وہ صدقہ کرتا ہے۔

بقیہ بر صفحہ ۴۸

مطبوعات

(ادارہ)

تفسیر معالم القرآن : از جناب مولینا محمد علی صدیق کاندھلوی۔ ناشر: دارالعلوم شہابیہ، رنگ پورہ روڈ، لاہور۔ سفید کاغذ پر اچھی طباعت۔ ایک ایک پارے پر مشتمل ۱۱ مضبوط جلدیں۔

قرآن پاک دنیا کی وہ واحد کتاب ہے جس سے ہر زمانے کے علماء اور مفسرین نے اپنے اپنے دور میں پیدا ہونے والے مسائل کا حل اخذ کیا ہے۔ اردو میں متعدد مفسرینِ کرام نے قرآن پاک کی تفہیم و توضیح کے لیے مخلصانہ کوششیں کی ہیں۔ انہی بلند بخت مفسرینِ قرآن کی محفل میں سیالکوٹ کے مولانا محمد علی کاندھلوی بھی شامل ہیں۔

مولانا موصوف ہندوستان کے مشہور مردم خیز قصبہ کاندھلہ کے ایک معروف علمی و دینی خاندان کے چشم و چراغ ہیں، دیوبند کے فاضل ہیں، سیالکوٹ کے دارالعلوم الشہابیہ کے ناظم اعلیٰ ہیں اور خطیب و واعظ ہونے کے علاوہ متعدد وقیع و مستند کتابوں کے مصنف ہیں جن میں "معالم القرآن" یقیناً ان کا شاہکار ہے جو دنیا و آخرت میں ان کی عزت و سربلندی کا باعث بنے گا۔

"معالم القرآن" منفرد و ممتاز خصوصیات کی حامل تفسیر ہے۔ دوسری خصوصیت یہ ہے کہ مولینا کاندھلوی محترم نے عربی، فارسی اور اردو کے ہر مفسر قرآن کی مساعی سے استفادہ کیا ہے اور جابجا ان کے حوالے دیے ہیں۔ اس طرح معاشرتی، اقتصادی، سیاسی، نفسیاتی اور جذباتی مسائل جن میں قرآن اپنے مخصوص انداز میں رہنمائی فرماتا ہے، مولانا نے سلیس اور عام فہم انداز میں اس کی تشریح کر دی ہے۔ مولینا مسائل کے استنباط میں کسی خاص فقہی مکتبِ فکر تک محدود نہیں

رہے اور اسلام کو انہوں نے بحیثیت مکمل نظامِ حیات وسیع تر تناظر میں پیش کیا ہے۔
مولانا کاندھلوی کا اسلوب عام فہم ہے۔ اس طرح یہ تفسیر نہ صرف علماء اور دینی درسگاہوں کے طلبہ کے لیے متاعِ بے بہا ہے بلکہ عام قارئین اور درس قرآن دینے والے مبلغین کے لیے خصوصی قدر و قیمت کی حامل ہے۔ یہ تفسیر ہر دینی و علمی لائبریری میں موجود ہونی چاہیے۔
(ڈاکٹر عبدالغنی فاروق)

اقبال کا نظریہ خودی: از جناب ڈاکٹر عبدالمغنی (پٹنہ یونیورسٹی)۔ ناشر: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، جامعہ نگر نئی دہلی ۱۱۰۰۲۵ صفحات ۵۴۲، کاغذ دبیز (کچھ کریم کلر کے قریب) کتابت و طباعت خوشنما، جلد مضبوط مع رنگین گرد پوش۔ حیرت ہے کہ پاکستان میں اس کتاب کا کوئی فروخت کنندہ نہیں۔ شاید علم کے خلاف قانون کی معیت ہو۔
قیمت ۱۵۰ روپے۔

جواہر و خزف ریزوں کی چھانٹ پرکھ میں ژرف نگاہی رکھنے والے صاحبِ قلم کو دیکھتا ہوں تو سوچتا ہوں کہ میں تنقید و توضیح کے ایسے بڑے کارنامے پر کیا لکھوں۔ کتاب پڑھتا ہوں تو میرے اندر کا تبصرہ نگار گم ہو جاتا ہے اور میں الفاظ کے ساغروں میں بھری ہوئی ادبی لطافتوں میں کھو جاتا ہوں۔ حواس بحال ہوتے ہیں تو سوچتا ہوں کہ کیا لکھوں۔

ڈاکٹر عبدالمغنی کے کام کا پھیلاؤ عمودی اور افقی دونوں طرح سے ہے اور بڑی تیزی سے اس پھیلاؤ میں اضافہ ہو رہا ہے۔ خاص بات یہ کہ ڈاکٹر عبدالمغنی کے قلم کا مرکزِ طواف (۱۹۵۷ سے) اقبال ہے۔

میں کچھ اور لکھ سکوں یا نہیں، یہ ضرور لکھنا چاہتا ہوں کہ جدید دور کی نہایت سنگلاخ اور مہیب اور معماتی و جناتی تنقید نگاری میں بڑے درجے اور بڑے کام کے ساتھ نمودار ہونے والا یہ پہلا مبصر ہے۔ یہ پہلا مبصر ہے جس کے ہاں مغربی ادب پر حاوی ہونے اور اس کا استاذ ہونے کے باوجود، مغربیت کا آسیب مسلط نہیں ہے۔ جس نے اغیار کے ہاں سے اصطلاحیں نہ چرائی ہیں نہ بھیک میں لی ہیں۔ اپنی اصطلاحیں خود بنائی ہیں جو بہت عام فہم ہیں، بڑی بڑی "چٹانیں" آپ کو کہیں نہ ملیں گی جن کی سب سے بڑی ضرورت یہ ہے کہ وہ مرعوب کر دیتی ہیں اور ابہام، ایہام یا اوہام کا کہر بھی ان کے گرد چھایا ہوا ہو تو پھر تو چڑیلیں معلوم ہونے لگتی ہیں۔ عبدالمغنی کی تنقیدی تحریر کو آپ پڑھیں تو بھول جائیں گے کہ یہ نقد و نظر کا قصہ ہے، بلکہ یوں

لگے گا کہ ایک تازہ نگارش سامنے آرہی ہے جس میں فقروں کی خوبصورتی اور معانی کی لطافت اور فصاحت و بلاغت کی لطافت جابجا پھیلی ہوئی ہے گویا ہر ورق "دامان باغبان و کفِ گلفروش" ہے۔ کتاب کو دیکھ کر بار بار جی چاہتا ہے کہ اس کی عبارات کو پڑھوں۔

فی الحقیقت اقبال کو تنقیدی میزان پر تولنے سے زیادہ ضروری یہ ہے کہ لوگ اسکے اشعار کی صحیح معنویت' اس کے فنی مقام' اس کے ایمانی و فکری پس منظر اور اس کے ہدفِ حقیقی کو سمجھیں۔ یہ چیزیں واضح ہونگی تو تنقید و تبصرہ از خود ساتھ ساتھ ہو جائیگا جیسے دودھ کے پیالے میں بالائی گویا "بالائی آمدنی" ہوگئی جو حلال بھی ہے۔ اقبال جن کھینچا تانیوں کا شکار رہا ہے اور جس طرح اس کے فکر و فن کے پارچے اپنی اپنی پسند کے مطابق لوگوں نے اٹھا کر خوانچے لگائے اور آوازیں لگائیں کہ "من قاش فروش فن صد پارہ اقبال"۔ ڈاکٹر عبدالمغنی کا تنقیدی کارنامہ یہ بھی ہے کہ انہوں نے قاش فروشانِ شعر اقبال کا راستہ تصریحات اور وضاحتوں اور تفہیم اقبال سے روک دیا اور پھر ساتھ ساتھ معترضین یا غلط اندیشیوں کے مریضوں کی چارہ گری کے لیے مضبوط دلائل کی اکسیر کو جواباً استعمال کیا۔ اس معاملے میں اقبال شاید غیر معمولی حد تک مظلوم ہے۔ ڈاکٹر عبدالمغنی کی تنقید اقبال کی مظلومیت کا مداوا بھی کرتی ہے اور اس کے فکر و فن کی پرکھ کا کام بھی کرتی ہے۔

خودی اقبال کے فلسفے اور فکر کا مرکزی نکتہ ہے۔ یہ کتاب درحقیقت اسی نکتے کا مفہوم نمایاں کرنے کے لیے لکھی گئی ہے کہ اقبال نے کیا سوچا؟

بدقسمتی سے میرے مقدر میں تعارف کتب کے صفحات ضرورت سے کم ہیں اور اس کتاب پر تبصرہ نگار کو ایک جامع نوٹ لکھنے کے لیے کئی صفحے درکار ہیں۔ بہرحال چادر دیکھ کر پاؤں پھیلاتے ہوئے بھی کچھ زیادتی ہو سکتی ہے۔

بالفاظ ڈاکٹر عبدالمغنی "اقبال کے نظام افکار کے عوامل و عناصر کی تنقیدی تشریح و توضیح" (سرورق) کو وہ اپنے والد مرحوم مولینا سید عبدالروف کے نام سے معنون کرتے ہیں "جو اپنی حدود میں "خودی" کا ایک نمونہ تھے۔"

ابتدائی مضمون میں لکھتے ہیں کہ "سارتر کی وجودیت سے اقبال کی خودی کا موازنہ کیا جائے تو واضح ہوگا کہ مستقبل کا نظریہ بننے کی صلاحیت اسی میں ہے' نہ کہ وجودیت میں!" (ص ۱۲) "خودی ایک بہت سادہ سی فطری چیز ہے' جسے ہم بآسانی عرفان ذات کہہ سکتے ہیں۔ اپنے آپ کو پہچاننا' اپنی حد میں رہنا' اپنے نفس کی معرفت' اس کا تزکیہ' اسکی ترقی' شخصیت کی تعمیر' جوہرِ ذاتی کی

پرورش، کردار کی تشکیل و تہذیب۔" (ص ۱۴)

"خودی کی یہ موت حیات پر ایک ضرب ہے اور پوری کائنات کا زیاں" ..... "وہ زمین پر نائبِ خدا ہے۔ اس کی جنت اس کے خونِ جگر میں ہے۔ محاورے میں یوں کہنا چاہیے کہ وہ دنیا کو جنت بنانے کے لیے پیدا کیا گیا ہے۔ اس کے عروج کی کوئی حد بندگی، رب کے سوا نہیں" (ص ۱۴)

"یہ خود آگاہی، خود نگری اور خود گری ہے۔" ــــــــ "یقیناً اس میں انفرادیت کی بو ہے مگر وہ اجتماعیت کا رنگ لیے ہوئے ہے۔ جدت وہی معتبر و موثر ہوتی ہے جس کے پیچھے کوئی روایت بنی ہوئی ہو اور جس کے آگے ایک روایت بننے والی ہو۔

یہ سوال کہ خدا کے ساتھ خودی کے ارتباط سے کیا مسائل پیدا ہوتے ہیں، ڈاکٹر صاحب تین چار نکات میں "ایک ارتقا کو لیتے ہیں۔ مگر وہ اس مرعوب کن مفروضہ کا رخ ہی بدل دیتے ہیں۔ لکھا کہ:

> "یہ تنازع البقا کسی حیوانی ارتقا کے لیے نہیں ہوتا اور بقائے اصلح کا مطلب وحشیانہ طاقت کی برتری نہیں ہے۔ دنیا میں ترقی کی اصل کشمکش خیر و شر کی قوتوں کے درمیان ہے۔ روئے زمین رزم گاہِ خیر و شر ہے ...... خیر زینتِ وجود ہے اور شر ننگِ ہستی۔ انفرادی و اجتماعی دونوں قسم کی خودی کا عمل اسی آفاقی صداقت پر مبنی ہو چاہیے۔" (ص ۲۱)

اسی کے ساتھ دوسری بحث جبر و قدر کی ہے، وہ پوری ہی دلچسپ ہے مگر ایک جملہ عرض ہے۔ "جو ہو چکا وہ تقدیر تھی، جو ہونے والا ہے اس کی تدبیر کرنی چاہیے (ص ۲۱) تقدیر خدا کی ہے اور تدبیر خودی کی۔" (ص ۲۲)

پھر لکھا کہ "ازل اور ابد کے درمیان وہ (انسان) کائنات کا سب سے اہم وجود ہے" عبدہ (بندہ خدا) کا مقام سدرۃ المنتہیٰ (کائنات کی سرحد آخریں) تک وسیع ہے۔" (ص ۲۳) خودی کا مرد کامل خیر البشر ہے۔ (ص ۲۴)

اقبال فہمی کے لیے اس وقت کے مغرب کی ماہیت کو دو صفحوں میں بڑی خوبی سے سمجھایا گیا ہے۔ اس کا ایک جملہ یہ ہے کہ "وہ (یعنی انسان) جتنا جتنا کائنات کے مظاہر دریافت کر رہا تھا، اتنا ہی اتنا اپنی ذات کو گم کرتا جا رہا تھا" (ص ۲۶)۔ پھر مشرق کا حالِ زار بیان کیا تو ایک نشتر سا دل میں اتار دیا کہ "اورنگ زیب کی وفات کے پچاس سال بعد ہی ہندوستان کے محاذ پر مشرق نے

مغرب سے پہلی شکست کھائی۔ ۱۷۰۵ میں ایشیا کی سب سے بڑی طاقت کا جو زوال شروع ہوا۔ فقط سو سال کے اندر ۱۸۵۷ میں اپنی آخری حدوں کو پہنچ گیا۔" ـــــــــ "فوجی غلبے' سیاسی طاقت اور معاشی ترقی نے بالآخر علم و دانش اور تعلیم و تہذیب کا قبلہ بھی مغرب کو بنا دیا جس کی تقلید مشرق کا مقدر بن گئی۔" (ص ۲۸)..... "لیکن مشرق پورے طور پر مغرب نہیں بن سکتا تھا' چنانچہ وہ دو دنیاؤں کے درمیان معلق ہو کر رہ گیا..... پرانے عقیدوں پر یقین متزلزل ہو گیا..... اہلِ مشرق کے کردار میں منافقت آگئی (ص ۲۷) یہ پورے نوٹس پڑھنے کے ہیں۔ اس قصہ کے خاتمے کا جملہ توجہ طلب ہے کہ:

> "دم توڑتے ہوئے برطانوی سامراج کی آخری لات برصغیر کے مونہہ پر پڑنے والی تھی۔ ایک دہشت کی فضا طاری ہو رہی تھی۔ اس دہشت کو دور کرنے کے لیے اقبال نے ایک نسخہ تجویز کیا اور دنیا سے رخصت ہو گئے۔" (ص ۳۰)

بقول اقبال ۔ تپیدم' آفریدم' آرمیدم! ڈاکٹر صاحب نے اوپر کی دو سطروں میں اقبال کو تاریخی احوال کے منظرنامے میں صحیح مقام پر کھڑا کر کے ان کی خدمت میں نہایت ہی خوبصورت خراجِ تحسین اس کارنامے کے لیے پیش کیا ہے جسے وہ انجام دے گئے۔

پھر زیرِ عنوان انسانیت ڈاکٹر عبدالمغنی صاحب نے جو خوبصورت تحریر مرحوم کے اشعار کے ساتھ لکھی ہے' اس میں سے چند فقرے ـــــــ "دراصل پوری انسانیت کا فروغ اقبال کا مطمح نظر ہے۔"..... "عالم بشریت کی زد میں ہے۔ گردوں' عروج آدم خاکی' فرشتے آدم کو جنت سے رخصت کرتے ہیں اور روح ارضی آدم کا استقبال کرتی ہے' وہ ارتقائے انسانی کا ایک دستاویزی اعلان ہے۔ انسان کے موضوع پر اس سے بہتر اور حسین تر کوئی تخلیق جہانِ ادب میں موجود نہیں۔" ....."وہ (اقبال) ایک عالمی معاشرے کے پیغام بر تھے۔" ..... (چاہتے تھے کہ) ایک صالح انقلاب کے لیے کام کیا جائے۔" (ص ۳۲) ...... "اس پس منظر میں وہ ملّتِ بیضا کو ایک کلیدی اہمیت اور مرکزی حیثیت دیتے تھے۔" ..... "کیونکہ توحید کی امانت صرف اسی ملت کے سینوں میں محفوظ تھی" (ص ۳۳)۔ پھر اقبال کے اشعار کو گواہ بنا کر ڈاکٹر صاحب نے یہ ثابت کیا ہے کہ وہ اپنے مخاطبین کو عصرِ حاضر کے غلط رجحانات کا مقابلہ کرنے کے لیے تیار کرتے ہیں۔ "ان کا خیال تھا کہ ایک نئی دنیا پیدا ہو گی جس میں ایک نیا انسان سانس لے گا اور وہ ایک نئے نصب العین کے ساتھ ارتقاء کی بلند تر منزلوں کی طرف گامزن ہو گا۔" (ص ۳۷)

ڈاکٹر عبدالمغنی نے اقبال کی نگارشات کی نہایت موزوں ترتیب کو پیش نظر رکھتے ہوئے سب

بقیہ بر صفحہ ۲۷

REGD. NO. L 5346

PHONE : 234014
236665

MONTHLY **TARJUMAN-UL-QURAN** LAHORE